باب چہارم

اقبالؔ اور جدیدیت

شاعری اور نثری تحریروں کے حوالے سے

اقبال ایک بڑے شاعر ہی نہیں، بلکہ ایک بڑے مفکر بھی ہیں۔ شاعری کو ذریعۂ اظہار بنا کر انہوں نے اپنے خیالات وافکار کو ہم تک پہنچایا۔ اقبال ایک ایسے منفرد شاعر ہیں جن کی شاعری کو ان کے فلسفیانہ فکر سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ وہ بیک وقت ایک بڑے شاعر اور باضابطہ فلسفی بھی ہیں۔ انہوں نے اپنے فلسفیانہ افکار وخیالات کو نہایت جامع اور خوبصورت انداز میں اپنے انگریزی خطبات (The Reconstruction of Religious Thought in Islam) میں پیش کیا ہے۔ اُردو شاعری میں اقبالؔ کو وہی مرتبہ حاصل ہے، جو اُن ہستیوں کو، جنہوں نے ہندوستان میں اسلامی طرزِ فکر کی تنظیم جدید میں حصہ لیا۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی شاعری اور فکر نے لاکھوں لوگوں کو متاثر کرنے کے ساتھ ساتھ متحرک بھی کیا۔

اقبالؔ کی فکر کی گہرائیوں تک پہنچنے کیلئے یہ ضروری ہے کہ ہم اُن کے عہد کے سماجی تصورات اور ان روایات یا اُنہیں ورثے میں ملنے والے سلسلۂ افکار کا مطالعہ کریں، کیوں کہ تمام ایجادات، جو ورثے میں ملتی ہیں ان ہی کی بدولت مستقبل کا ڈھانچہ تیار ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبالؔ کے دور کے حالات سے واقفیت حاصل کرنا لازمی ہے۔

اقبالؔ نے جس زمانے میں ہوش سنبھالا، وہ تاریخ کے اعتبار سے تبدیلیوں کا زمانہ تصور کیا جاتا ہے۔ اقبال کی پیدائش اٹھارویں صدی کے ربع آخر میں ہوئی۔ ہندوستان انگریزوں کی غلامی میں پوری طرح سے پہلے ہی آچکا تھا۔ مسلمانوں کی ہندوستان پر حکومت تقریباً ایک صدی پہلے ہی دم توڑ چکی تھی۔ مسلمانوں کی موجودہ صورت حال بُری تھی۔ ہندو اور مسلمان آپس میں لڑ رہے تھے۔ انگریز اُن کر لڑانے میں مصروف عمل تھے، تاکہ خود حکومت آسانی سے کر سکیں۔ ہندوستانی غلامی کی زندگی جی رہے تھے۔ اس وقت ہندو اور مسلمان ہی نہیں بلکہ دنیا کا بیشتر حصہ

نوآبادیاتی استعماریت اور استبداد کی سیاسی، ذہنی اور معاشی غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ اور جہاں جہاں نوآبادیاتی ظلم نہیں پہنچا تھا، وہاں وہاں ملوکیت، آمریت، جاگرداریت اور مذہبی پیشوائیت اپنی بدترین شکلوں میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کا مقدر بنی ہوئی تھی۔ اقبالؒ اور ان کے عہد کے بارے میں ڈاکٹر جمیل جالبی یوں رقمطراز ہیں:

''اقبال نے اپنی نوائے شوق جس ماحول میں بلند کی آپ اس سے ناواقف نہیں ہیں۔ کرۂ ارض کی تاریخ میں وہ زمانہ اقبال کے ممدوح گوئٹے کے الفاظ میں ایک ایسا زمانہ تھا جب پُرانی دنیا مر رہی تھی اور نئی دنیا پیدا نہیں ہوئی تھی، تاریخ کے بطن میں عظیم انقلابات کروٹیں لے رہے تھے۔ اقبالؔ نے انقلاب روس کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ رومتہ الکبریٰ کا ضمیر انؔ کی آنکھوں کے سامنے دِگرگوں ہو رہا تھا اور روح المنیٰ نئے تغیرات کیلئے تیار ہو رہی تھی۔ اقبالؔ کی آنکھوں نے گراں خواب چینیوں کو سنبھلتے دیکھا اور ہمالہ کے چشمے ان کی آنکھوں کے سامنے اُبل رہے تھے۔ اس دور میں مسلمانانِ عالم بھی اپنی تقدیر کی تشکیل نو کا آغاز کر رہے تھے۔ اقبالؔ نے روحِ مسلمان کے پیچ و تاب کو اپنی نوائے سرمدی میں جگہ دی اور معمارِ حرم کی تعمیر جہاں کیلئے اُٹھ کھڑا ہونے کا پیغام دیا''۔[1]

اقبالؔ نے اس زمانے میں ہوش سنبھالا جب زمانہ ڈگمگا رہا تھا۔ ماضی اور مستقبل یا روایت اور جدت کے درمیان جنگ شروع ہو چکی تھی۔ جمال الدین افغانی، شاہ ولی اللہ دہلوی، محمد بن عبدالوہاب، کارل مارکس، نٹشے، غالب، حالی، سرسید احمد خان، شبلی نعمانی، راجہ رام موہن رائے، گوئٹے، فرائڈ، نیوٹن، ڈارون وغیرہ جیسے مجدّد، مفکر، سائنس دان پیدا ہو چکے تھے۔ اقبالؔ نے جہاں ان مفکروں اور دانشوروں کا بغور مطالعہ کیا، وہیں انقلاب روس اور انقلاب چین یا پھر

ا: نئی تنقید، (مرتب: خاور جمیل)، ص ۲۴۵۔

کمال مصطفےٰ اتاترک کی جدید تُرکی کو بھی اپنی آنکھوں سے دیکھا اور یہ مشاہدہ کیا کہ دنیا کیسے کروٹیں بدلتی رہتی ہے۔ تاہم یہ بھی یاد رہے کہ اقبالؔ کا مطالعہ یا فکری مآخذ صرف اپنے دور کے مفکروں اور انقلابات پر ہی مشتمل نہیں ہے، بلکہ جہاں انہوں نے اسلامی تعلیمات کا گہرا مطالعہ کیا تھا وہیں وہ دیگر مذاہب کی تعلیمات سے بھی واقفیت رکھتے تھے۔ اُن کا مطالعہ اور فکری مآخذ قبل مسیح کے مفکروں جیسے سقراط، ارسطو، افلاطون وغیرہ سے لے کر اپنے زمانے کے کارل مارکس اور شبلیؔ نعمانی تک تھا۔ اُن کے فکری مآخذ مولانا رومؔ سے لیکر کے بھرتری ہری تک پھیلے ہوئے تھے۔ یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ جہاں اقبال جدت کے علمبردار تھے وہیں، اُن کے فکری مآخذ ماضی سے جڑے ہوئے تھے۔ پروفیسر مشیر الحق لکھتے ہیں:

''اقبال اصلاً اسلامی مفکر تھے اور ہمیں ان کے سیاسی خیالات میں عصریت کی روح کو تلاش کرتے وقت اس بات کو ذہن مین رکھنا پڑے گا کہ ان کی عصریت ماضی سے قطع تعلق پر نہیں، بلکہ اس کی بنیادوں پر قائم تھی''۔[1]

پروفیسر مشیر الحقؔ کے مذکورہ بالا اقتباس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ علامہ اقبال کے خیالات میں جب بھی جدیدیت کو تلاش کیا جائے، اُس وقت اقبالؔ کی جدیدیت روایت سے انحراف نہیں کرتی، بلکہ اُس کی جدیدیت ماضی کی بنیادوں پر ہی قائم ہے یا پھر روایت کی تجدید ہے، جو ایک بڑے مفکر کی ایک بڑی نشانی ہوتی ہے۔ اقبالؔ کی شاعری اور نثری تحریروں میں جہاں اسلامی مفکروں اور دانشوروں کا ذکر اکثر و بیشتر ملتا ہے، وہاں وہ غیر مسلم مفکروں اور دانشوروں سے بھی مستفید ہونے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے۔ اقبال صرف موجودہ سائنسی انقلابات سے ہی استفادہ کرنے کی تلقین نہیں کرتے، بلکہ وہ رومیؔ، سنائیؔ، عطارؔ، ابن خلدون، ابن ہشام، ابوبکر محمد بن ذکریا رازی، ابن سینا، ابن رشد، ارسطو، افلاطون، البیرونی، بقراط وغیرہ

۱: جدیدیت اور اقبال، (مرتب: پروفیسر آل احمد سرور)، ص ۴۹۔

جیسے مفکروں اور دانشورون سے بھی استفادہ کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ گویا اقبال ایک ایسے مفکر اور دانشور تھے جنہوں نے اپنی بصیرت کے ذریعے ماضی کی روشنیوں کو حال اور مستقبل میں اس طریقے سے پیش کیا کہ وہ قدیم ہونے کے باوجود جدید ثابت ہوئے اور ہمیں ان روشنیوں کی ضرورت عصری مسائل میں صاف نظر آنے لگی۔ پروفیسر مشیر الحق اپنے مضمون میں آگے چل کر رقم طراز ہیں:

''ماڈرن مسلم مفکر کی تعریف جو ہم نے کی ہے، اُس کی رُو سے ضروری ہے کہ وہ ماضی کے اُجالے میں مستقبل کی طرف قدم اُٹھائے۔ جہاں تک اقبال کا سوال ہے، وہ اس معیار پر پورے اترتے ہیں''[1]

بے شک اقبال اس معیار پر پورے اُترتے ہیں۔ کیونکہ جہاں تک جدیدت کو ہم نے پچھلے ابواب میں سمجھنے کی کوشش کی ہے، اُس سے صاف ظاہر ہے کہ اقبال ایک جدید مفکر ہیں، کیونکہ جدیدیت کے معنی ''مسلسل عمل'' کے ہیں، جس میں ماضی حال اور مستقبل ایک دوسرے سے مل کر بنتے ہیں اور آپس کی یہی آویزش و آمیزش ''جدیدیت'' کہلاتی ہے۔ اقبال کی فکر بھی اسی آویزش و آمیزش کی ایک زندہ مثال ہے۔ انہوں نے کبھی روایت سے انحراف نہیں کیا یا پھر نئے کو ہی گلے نہیں لگایا، بلکہ انہوں نے مستقبل کی تعمیر روایت کی بنیادوں پر ہی قائم کی۔ اقبال جدید ذہن کے معمار بھی ہیں اور ان کی فکر میں قدیم روایت کا تسلسل بھی ہے اور اقبال خود اس کی گواہی ذیل کے شعر میں یوں پیش کرتے ہیں ؎

زمانہ ایک، حیات ایک، کائنات بھی ایک
دلیل کم نظری قصۂ قدیم و جدید

۱: جدیدیت اور اقبال، (مرتب: پروفیسر آل احمد سرور)، ص ۵۔

اقبال ایک روشن خیال فلسفی اور مفکر تھے، انہوں نے ہمیشہ سچائی کا ساتھ دیا۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے خیالات متحرک ہیں۔ چاہے وہ خیالات مذہبی ہون یا سماجی یا پھر سائنسی ہوں یا سیاسی۔ اس سچائی سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اُن کے افکار و خیالات میں بیداری اور تحرک ہے۔ یہی اُن کی عظمت ہے اور اسی وجہ سے وہ جدید سمجھے جاتے ہیں۔ اُن کی جدیدیت قدیم کو رد کرنے کا نام نہیں ہے بلکہ اس معاملہ میں قدیم و جدید کا قصہ اُن کے سامنے دلیل کم نظری ہے اور اس کی آمیزش و آویزش وسعت نظری۔

ہر مذہب کے ماننے والے اپنے مذہب کو قدیم نہیں سمجھتے ہیں۔ پہلگام سے پوتر گپھا تک کا راستہ یاتری بڑی مشکل سے طے کرتے ہیں اور ہزاروں سال پُرانی گپھا میں جا کر شولنگ کا درشن کرتے ہیں، گوتم بدھ کے ہزاروں سال پُرانے مجسمہ کو آج بھی اُس کے ماننے والے پوجتے ہیں، گرجا گھر میں رکھا ہوا مجسمہ حضرت عیسیٰؑ کی صلیب پر لٹکانے کی یاد اب بھی تازہ کرتا ہے، جیسے اس کو ابھی لٹکایا گیا ہو۔ اسی طرح خانہ کعبہ جتنا قدیم ہے اُتنا ہی جدید ہے اس کے ہر پتھر اور اینٹ سے مسلمانوں کا ایک نفسیاتی رشتہ قائم ہے جو روز بہ روز اور زیادہ مضبوط ہوتا جا رہا ہے۔ اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مذہبی رسومات کے اعتبار سے اگر کوئی چیز ہمارے لئے قدیم نہیں ہے اور اس کو ہم اپنے لئے کسی سرمائے سے کم نہیں سمجھتے۔ علم و ادب کا معاملہ بھی اسی نوعیت کا ہے۔ غالبؔ کی شاعری اور نثر کو اگر ہم نہ پڑھیں تو وہ فرسودہ اور قدیم ہے اور اگر اُس کا مطالعہ کریں تو وہ جدید ہیں۔ عصر حاضر میں روز مرہ استعمال ہونے والے محاورات و استعارات ہمیں کہاں سے حاصل ہوئے یہ تو ہماری ایجادات نہیں ہیں۔ عکاز کے میلوں میں سنائی جانے والی غزلیں آج کل کی غزلوں سے مختلف نہیں۔ تقریباً دو ہزار سال پُرانی اسی غزل کی تکنیک آج کی غزل میں استعمال کی جاتی ہے اور روز بہ روز غزل کا معیار بلند ہوتا

جارہا ہے۔ بلکہ آج کل ہم اپنے روزمرہ مسائل اور تجربات غزل کی اُسی تکنیک میں سمو کر لوگوں کو سناتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ آج کل عکاز کے میلے نہیں لگتے۔ بلکہ جدید تیکنالوجی نے ہماری دشواریوں کو آسان کر دیا ہے۔ عکاز کے میلے میں بہتر قصیدہ نگار کو بہترین تخلیق کے اعزاز میں اُس کا قصیدہ سنہری الفاظ سے لکھ کر، خانہ کعبہ کے دروازے پر آویزان کیا جاتا تھا اور آج بہترین تخلیق کار کو یا تو سونے کا تمغہ یا پھر کوئی انعام جیسے بھارت رتن، غالب ایوارڈ، اقبال ایوارڈ وغیرہ سے نوازا جاتا ہے۔ اس دلیل کے لکھنے کا مقصد صرف یہ عرض کرنا ہے کہ جدید دور میں قدیم شامل ہے اور جس جدید میں قدیم شامل ہو، وہی جدید یا جدیدیت کہلاتا ہے۔

اقبال کی تخلیقات بھی اسی جدیدیت کی عکاسی کرتی ہیں۔ ایک بڑے فن کار کے فن کو ماضی، حال اور مستقبل کے خانوں یا زمانوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا ہے اور اقبال کا فن بھی اس قسم کی تقسیم سے مبرّا ہے۔ اقبال کی تخلیقات میں ماضی، حال اور مستقبل کے سارے تجربات اس طرح اقبال نے پیش کئے ہیں کہ یہ تخلیقات زمانے کو تقسیم نہیں ہونے دیتیں، بلکہ یہ ایسے اصول بن گئے ہیں کہ زمانہ کسی طرف بھی چلا جائے، ان ابدی اصولوں میں نئے معنی اسی طرح نظر آئیں گے کہ ہر دور کا انسان ان میں صداقت کی نئی خوشبو محسوس کر سکے گا اور یہ اصول ہر دور میں اور ہر منزل پر تغیر پذیر انسانیت کا ساتھ دے سکیں گے۔

اقبال جدید ذہن کے مالک تھے۔ وہ جمود سے نفرت اور حرکت سے محبت کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی تمام تخلیقات تغیر کا تصور دیتی ہیں۔ ان کے نزدیک عمل پیہم ہی انسان کو فاتح عالم بنا سکتا ہے۔ اقبال ایسا عمل چاہتے ہیں، جو ہر قسم کی بندش سے آزاد ہو۔ اُن کے نزدیک قدیم، جدید کے لئے سرچشمۂ وجدان بن جاتا ہے۔ انہیں اس بات سے اتفاق نہیں کہ ماضی ہماری عقل کو مفلوج کر دے گا یا اس سے جمود طاری ہو جائے گا، بلکہ یادِ عہد رفتہ اُن کی خاک

کیلئے اکسیر کا کام کرتی ہے

یادِ عہد رفتہ میری خاک کو اکسیر ہے
میرا ماضی میرے استقبال کی تصویر ہے

اقبال ماضی سے استفادہ کرنے کی تلقین ضرور کرتے ہیں لیکن ماضی میں غروب ہو جانے سے منع کرتے ہیں۔ انہوں نے ہندوستان سے ہسپانیہ تک ہر ملک کا چشمِ باطن سے مشاہدہ کیا ہے۔ وہ مسجد قرطبہ کی غزل خوانی اسی لئے کرتے ہیں تا کہ ملت اسلامیہ اپنی عظمتِ رفتہ اور حکومت اور کارناموں کو دیکھ کر جاگ جائیں اور اپنی تعمیر کیلئے از سرِ نو تیار ہو جائیں۔ وہ پُرانی شے کو نئی پیکنگ میں فروخت کرنے کی ترغیب نہیں دیتے ہیں۔ بلکہ زمانے کے ساتھ چلنے کی ترغیب دیتے ہیں اور اپنے اسلاف کی طرح سر اُٹھا کر چلنے کی ترغیب دیتے ہیں۔

اقبال نے تغیر کو پسند کر کے ہمیشہ حرکت کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ اُن کے نزدیک بہتر فکر اور بہتر عمل ہی انسان کو حرکی بنا سکتا ہے۔ صرف اپنے اسلاف کے عظیم الشان کارناموں پر فخر کرنے سے زندگی حرکی نہیں بن سکتی بلکہ اپنے اسلاف کی طرح عظیم الشان بن کر دکھانا ہے۔ زندگی ایک مسلسل تحقیقی عمل ہے۔ جس وقت یہ عمل رک گیا یا اس پر جمود طاری ہوا اُسی وقت ترقی کی منزلوں کا یہ سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔ اقبال کے فکری مآخذ جن لوگوں سے جڑے ہوئے ہیں وہ مسلسل عمل کے قائل ہیں۔ ان معنوں میں اقبال جدیدت کے علمبردار ہیں۔ جہاں تک جدیدیت کا تعلق ہے، جدیدیت کے اصل معنی بھی مسلسل عمل کے ہی ہیں اور اقبال مسلسل عمل کے قائل تھے۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اقبال کے پیام کی اس حرکتیت اور اثر آفرینی کا راز کیا ہے؟ اس سوال کا جواب ڈھونڈنے کیلئے اقبال کے فکری مآخذ کے پس منظر میں جانے کی یہاں ضرورت ہے۔ یہاں ہم اس پر مختصر نظر ڈالنے کی کوشش کریں گے۔

اقبال کو اُن مسلم مفکرین کے سلسلۂ افکار سے متاثر ہونے والوں کی صف میں شامل کیا جانا چاہئے، جن کے سرغنہ شاہ ولی اللہ دہلویؒ تھے اور جن کی اتباع بعد میں سرسید احمد خان نے کی۔ شاہ ولی اللہؒ ایک مجدد تھے، جنہوں نے اپنی آنکھوں سے مغل حکومت کا زوال دیکھا۔ مسلمان انتشار کا شکار تھے اور تقریباً چھ سو سالوں سے حاکم ہونے کے باوجود دینی اور سماجی دونوں اعتبار سے پسماندہ تھے۔ شاہ صاحب نے اسلامی نظریات اور عمل میں غیر اسلامی عناصر کے خلط ملط ہو جانے کو اس کا سبب قرار دیا۔ وہ اسلامی حکومت اور مسلمانوں کی حکومت کو الگ الگ سمجھتے ہیں۔ انہوں نے تقلید کے خلاف جہاد شروع کیا۔ فرسودہ تصورات، توہم پرستی، عقائد سے وابستگی اور کٹر پن کی زبردست مخالفت کی۔ انہوں نے مشرکانہ عقائد و اعمال کی جڑ پکڑ لی اور اس کو نکال پھینکنے کی کوشش کی۔ انہوں نے اصلاح عقائد اور توحید خالص کی دعوت کے سلسلہ میں قرآن مجید کے ترجمہ پر زور دیا۔ انہوں نے فارسی اور اُردو میں قرآن پاک کے تراجم پر بے حد توجہ دی، تاکہ قرآن کا صحیح مفہوم لوگوں تک پہنچے اور وہ مشرکانہ کاموں سے باز رہیں۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ یوں رقم طراز ہیں۔

''امام ابن تیمیہؒ کے بعد اگر اس سلسلہ میں کسی کا نام پورے اعتماد کے ساتھ لیا جاسکتا ہے اور اس کا کام اہل علم کے سامنے ہے، تو وہ حضرت شاہ ولی اللہؒ ہیں۔ وہ عقائد کی تشریح و تفہیم اور اس کو سلف کے فہم و مسلک کے مطابق پیش کرنے کی پوری صلاحیت رکھتے تھے۔ اس لئے کہ انہوں نے ایک طرف یونانی فلسفہ کا گہرا اور وسیع مطالعہ کیا تھا اور علم کلام کا پورا سرمایہ ان کی نظر کے سامنے، اِن کی دست رس میں تھا، دوسری طرف قرآن کے دقیق النظر مُفسر، علم حدیث کے ماہر خصوصی اور اسرار و

مقاصد شریعت کے راز داں تھے''۔[1]

''تاریخ دعوت وعزیمت''، حصۂ دوم کے اگلے صفحہ پر مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رقم طراز ہیں:

''صدیوں سے عالم اسلام میں بالخصوص ان ملکوں میں جو علمی، عقلی اور درسی طور پر ایران کے زیر اثر تھے، جن متکلمانہ موشگافیوں، صفات کی دور از کار تاویلات جن سے نتیجتاً وہ معطل اور بے معنی بن کر رہ جاتی ہیں اور فلسفہ یونان سے ذہنی غلامی کی حد تک مرعوبیت کا دور دورہ تھا اور سلف کے متعلق ان کا خیال استخفاف تک پہونچا ہوا تھا۔۔۔اس پس منظر میں شاہ صاحبؒ کی یہ خدمت و جرأت مجتہدانہ اور مجددانہ کارنامہ ہے''۔[2]

علامہ اقبال شاہ ولی اللہؒ دہلوی سے بہت متاثر تھے۔ وہ اُن کے اجتہاد کو پسند کرتے تھے، جنہوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کو صحیح معنوں میں دین سمجھانے کی کوشش کی۔ حالانکہ وہ پوری طرح اس معاملے میں کامیاب نہیں ہوئے، پھر بھی ان کی اسی کوشش نے بعد میں آنے والے مفکروں کے لئے ایک طرح کی راہ ہموار کی، جن میں شاہ عبدالقادر دہلوی، شاہ رفیع الدین دہلوی، شیخ عبدالحق محدث دہلوی، محمد قاسم نانوتوی، سرسید احمد خان وغیرہ شامل ہیں۔

سرسید احمد خان اجتہاد کے قائل تھے، انہون نے مذہب کی ہیئت اور روح کے فرق کو واضح کر کے، اسے بدلتے ہوئے تاریخی حالات سے ہم آہنگ کرنے پر زور دیا۔ سرسید احمد خان، شاہ ولی اللہ دہلوی کی تعلیمات اور وہابی تعلیمات، دونوں سے متاثر تھے۔ وہ جدید ذہن

۱: تاریخ دعوت وعزیمت، حصہ پنجم، باب پنجم، شاہ ولی اللہ دہلوی صاحبؒ کے تجدیدی کارنامے معہ مسئلہ توحید کی علمی تنقیح وتحقیق، ص ۱۶۴

۲۔ ایضاً، ص ۱۶۷

کے مالک تھے اور جانتے تھے کہ ہم اُس ملک میں رہتے ہیں، جہاں مسلمان اور ہندو کو ایک ساتھ رہنا ہے۔ سرسید کی تعلیمی اصلاحات کا مقصد یہ تھا کہ وہ مسلمانوں کو ایک ذمہ دار قوم اور مسلمانوں کو ترقی کی دوڑ میں ہندو متوسط طبقے کے ہم دوش بنانا چاہتے تھے۔ سرسید پہلے مسلمان مصلح ہیں، جنہوں نے قوم کو مغربی علوم کی اہمیت سے آگاہ کیا اور اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعے مسلمانوں کو سائنسی اور انگریزی تعلیم سیکھنے پر آمادہ کیا۔ سرسید ایک روشن خیال انسان تھے۔ انہوں نے مسلمانوں کو تنگ نظری اور تعصب کے پردوں سے باہر نکال کر کھلی فضا میں سانس لینے کا طریقہ سکھایا۔ وہ مسلمانوں کو علوم نو سکھانے پر آمادہ کر رہے تھے اور ایک ایسی تحریک برپا کر چکے تھے، جس کی ایک جہت دنیا کی طرف اور دوسری جہت مذہب کی اس صورت کی طرف، جس کے لئے اجتہاد شروع کیا گیا تھا۔

اقبالؔ ان کے اس نظریہ سے متاثر تھے۔ کسی جھجک کے بغیر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اقبال بھی اسی تحریک کی پیداوار تھے۔ جس کا آغاز سرسید احمد خان نے کیا تھا[1]۔ تاہم اقبال اور سرسید احمد خان ایک ہی عہد سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔ سرسید انیسویں صدی کے اوائل، جبکہ اقبالؔ انیسویں صدی کے آواخر میں پیدا ہوئے۔ دونوں کے زمانے کے مسائل ایک دوسرے سے قدرے مختلف تھے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

> ''اقبال پہلے شاعر ہیں، جنہوں نے سرسید و حالیؔ کی روایت و فکر کو آگے بڑھا کر ایک ایسی واضح شکل دی اور اس میں ایسا پُرسوز آہنگ شامل کیا کہ ان سے پہلے اور نہ ان کے بعد ایسی شاعری تخلیق کی جا سکی۔ شاعری اور فکر نے مل کر اقبال کو وہ بنا دیا، جو وہ آج ہیں۔ اقبال کی شاعری اور دوسری تحریروں کے ساتھ مسلمانوں کی فکر،

ا: سہ ماہی رسالہ جامعہ، مدیر شمیم حنفی، جلد ۹، شمارہ ۱، ۲، ۳، جنوری تا مارچ، ۱۹۹۵، ص ۲۰۲۔

دور جدید کے مسائل اور عہد حاضر کے افکار کے دائرے میں داخل ہو جاتی ہے''[1]

ڈاکٹر جمیل جالبی کے متذکرہ بالا اقتباس سے یہ بات صاف ظاہر ہو جاتی ہے کہ اقبال اُسی کارواں کے روح رواں ہیں، جس کارواں کے ساتھی سرسید اور حالؔی تھے اور اس کارواں کے بانی شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور اُن کے رفقائے کار ہیں۔

اقبال ہندومت کی تعلیمات پر بھی گہری نظر رکھتے تھے۔ اُن کی نظر میں تیاگ کا ہندومت کا فلسفہ بے عملی کی تلقین نہیں کرتا، بلکہ نتائج کے ٹھیک یا غلط ہونے کا لحاظ کئے بغیر انسان کو عمل پیہم کی راہ پر لے جاتا ہے۔ اقبال کرشن جی کو اپنی شہرہ آفاق مثنوی ''اسرار خودی'' میں زبردست خراج تحسین پیش کرتے ہیں۔ کیوں کہ کرشن جی نے شریمد بھگوت گیتا میں 'نشکام کرم' یعنی بے لوث عمل اور اس کے نتائج پر بے حد زور دیا ہے۔ اقبال نے شری کرشن جی کے اس فلسفہ عمل کو سراہا ہے۔ کیونکہ عمل زندگی کو استحکام عطا کرتا ہے۔[2]

اقبال بھرتری ہری کو بھی ایک عظیم شخص قرار دیتے ہیں۔ انہوں نے اپنے فارسی مجموعۂ کلام ''جاوید نامہ'' میں بھرتری ہری کے ساتھ ہندوستان میں پیش نظر مسائل اور تضادات پر تبادلۂ خیال کیا ہے۔ اس ملاقات کے دوران بھرتری ہری نے اقبال کو عبادات اور زندگی کے بارے میں یوں کہا ؎

سجدہ بے ذوق عمل خشک و بجائے نرسد
زندگانی ہمہ کردار چہ زیبا و چہ زشت

یہ دراصل بھرتری ہری کی کسی سنسکرت نظم کا فارسی میں ترجمہ ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ عمل کے بغیر ریاضت اور عبادات کوئی معنی نہیں رکھتیں۔ زندگی عمل ہی کا دوسرا نام ہے۔ سمجھو اگر

۱: نئی تنقید، مرتب: خاور جمیل، ص ۳۱۷۔

۲۔ ڈاکٹر تسکینہ فاضل، مطالعۂ مثنوی اسرار خودی، ص ص ۳۶، ۳۷۔

عمل صحیح ہے تو زندگی کے مقاصد کی صحیح تکمیل ممکن ہے۔ یہاں (جاوید نامہ) میں بھرتری ہری اقبال کو عمل کے بارے میں ایک طویل غزل سناتا ہے۔ جس کا مختصر تجزیہ کچھ یوں ہے کہ ''عمل اور عمل کے نتائج دونوں ہی تمہارے ہیں یا بالفاظ دیگر جیسا عمل ویسا ردعمل''۔ علامہ اقبال نے زندگی کی جستجو اور تلاش کیلئے صرف ہندو فلسفہ کا مطالعہ ہی نہیں کیا، بلکہ یورپ، عرب، اور اہل فارس کے فلسفیانہ افکار سے اپنے تصورات کے ارتقاء میں کافی مدد لی ہے۔

مولانا جلال الدین رومؔی نے اقبال پر سب سے زیادہ اثر ڈالا۔ مولانا رومؔی نے عمل پر زور دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال اُن سے متاثر ہوئے۔ اُن کے زمانے میں جو صوفیانہ تصورات مروّج تھے، وہ زندگی کو بے عملی کی طرف لے جا رہے تھے۔ جبکہ رومؔی حرکت، امید اور یقین پر بھروسہ کرتے ہیں۔ انہوں نے امید، یقین اور حرکت کو ہی اپنا موضوعِ سخن بنایا۔ اُنہیں اس انسان کی تلاش تھی جو خدا کی تلاش میں ہو۔ عشق و محبت انسان کو وہ مقام اور قوت عطا کرتے ہیں، جس کے ذریعے وہ پوری کائنات کی تسخیر کرسکتا ہے۔ اقبال نے ''جاوید نامہ'' میں افلاک کی سیر اپنے مرشدِ روحانی مولانا رومؔی کی رہنمائی میں کی ہے۔ اقبال رومی کو ''پیر'' خود کو اُن کا ''مُرید'' قرار دیتے ہیں۔ رومؔی عمل پر زیادہ زور دیتے ہیں اور اقبال کے نزدیک عمل ہی سے انسان سچائی کی تلاش کرسکتا ہے۔

اقبال نے فارسی کے کئی اکابر شعراً شیخ سعدیؒ، عطارؔ، سنائیؔ، عرفیؔ، جامیؔ، حافظؔ شیرازی، وغیرہ کا بھی مطالعہ کیا تھا، مگر ان سب میں پہلا درجہ رومؔی کو حاصل ہے۔ ڈاکٹر اقبال خطبات میں فرماتے ہیں:

> ''آج دنیا کو کسی رومؔی کی ضرورت ہے، جو امید کی شمع جلائے اور زندگی کے لئے آتش شوق فروزاں کرے۔''[1]

ا: مترجم، ڈاکٹر عبدالشکور احسن، اقبال کی فارسی شاعری کا تنقیدی جائزہ، ص ۳۳۱۔

ڈاکٹر عبدالشکور احسن، اقبالؔ اور رومیؔ کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

''رومیؔ کے ساتھ اقبال کو والہانہ عقیدت اور وابستگی ہے۔ وہ رومیؔ کے افکار سے شدت سے متاثر ہیں اور ان کے پیغام میں قوموں کی تعمیر کا سامان دیکھتے ہیں۔ آج کے روحانی افلاس کا مداوا بھی انہیں رومی کی تعلیمات میں نظر آتا ہے''[1]

اقبال نے اپنے مطالعہ کو ہندوستانی اور ایرانی مشاہیر تک ہی محدود نہیں رکھا۔ بلکہ وہ اس سے آگے بھی نکل گئے۔ اسلام کا وسیع مطالعہ اُنہوں نے پہلے ہی کیا تھا، وہ قرآن، حدیث اور فقہ سے بھی باخبر تھے اور اسلامی تعلیمات پر اُن کی گہری نظر تھی۔ اس کے باوجود وہ اپنے مطالعہ کو مزید وسعت دینا چاہتے تھے۔ اس لئے اُنہوں نے عرب مفکرین اور ماقبل اسلام شعراء وادباء کا مطالعہ بھی بڑی دقتِ نظر سے کیا۔

قبل اسلام کے شاعر لبید، امرالقیس وغیرہ کا بھی انہوں نے مطالعہ کیا۔ لبیدؔ کے اس قول نے اقبال کو متاثر کیا کہ ''خدا کے سوا ہر شے باطل ہے'' وہ قبل اسلام پیدا ہوئے تھے اور حضرت ماویہ کے عہد خلافت میں لبید کا انتقال ایک سو چالیس سے ستاون سال کی عمر میں ہوا[2]۔ حضور ﷺ بھی لبید کے اس قول کو اکثر دہراتے تھے کہ ''خدا کے سوا سب غیر حقیقی ہے''۔ اقبال ان کے اس قول کو بے حد پسند کرتے تھے۔ لبید کا یہ قول وحدت الوجود کے تصور کی مکمل ترجمانی کرتا ہے۔ اس کے علاوہ اقبالؔ کو شیخ اکبر محی الدین ابن عربی، منصور حلاج، ابن خلدون، ابن رشد وغیرہ وغیرہ کا غیر معمولی مطالعہ تھا۔

اقبال نے ابن خلدون اور ابن رشد کو بہت سراہا ہے۔ وہ ان کے علم وفلسفہ کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ انہوں نے یورپ میں ایک ہنگامہ برپا کیا اور علم وادب میں ایک نیا انقلاب بپا کیا۔ ابن خلدون کی شخصیت میں بہت تنوع تھا۔ وہ بیک وقت ایک قد آور ادیب، شاعر اور ناقد

۱۔ اقبال کی فارسی شاعری کا تنقیدی جائزہ، ص ۳۳۱۔

۲۔ جامع اردو انسائیکلوپیڈیا۔ ۱، ادبیات، ص ۴۶۷۔

ہوتے ہوئے صف اول کا عالم دین تھا۔ فطرت نے اُنہیں ایک فلسفی پیدا کر دیا تھا۔ علم الاجتماع کے بانی اور فلسفۂ تاریخ کے مدون کی حیثیت سے اُنہیں مشرق و مغرب میں یکساں جانا جاتا ہے۔[1]

ابن رشد ارسطو کی کتابوں کا سب سے بڑا شارح اور مترجم ہے۔ طب میں بھی اس کی خدمات نہایت نمایاں ہیں، لیکن جو شہرت اُسے بحیثیت ایک فلسفی کے ملی، بحیثیت معالج کے نہ مل سکی، وہ بحیثیت مجموعی عقل کی بالادستی کا قائل تھا۔ ابن رشد کی تصانیف پچاس سے زائد ہیں۔ منطق، فلسفہ، حکمت، طب، فقہ، اصول فقہ، حدیث، مختصر یہ کہ ہر فن میں اس کی نگاہ بہت عمیق تھی۔[2]

یورپ میں اقبال نے، یورپ کے کھیتولیک کلیسا کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے والے اِکلارٹ (Eklart) کو بھی پڑھا، جو کلیسا کے اس ظلم کے خلاف کھڑا ہوا تھا کہ آدمی کو صبر و تحمل سے ہر ظلم برداشت کر لینا چاہئے۔

اقبال نے عینیت پسند جرمن فلسفی لابینز کا بھی مطالعہ کیا، جس کے نزدیک مادہ اور حرکت ایک دوسرے سے مربوط ہیں اور انہیں الگ کرنا ممکن نہیں۔ وہ جرمن کے اس کمزور طبقے کی نمائندگی کرتا تھا، جو جاگیردارانہ استحصال کا شکار تھا۔ اقبال کو فشٹے میں بھی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ فشٹے بھی ایک عینیت پسند جرمن فلسفی تھا، جس نے جاگیردارانہ مراعات پر سخت تنقید کی۔ اقبال نے فشٹے کے تصور ''انا'' میں اپنی شخصیت خودی (Ego) کی صدائے بازگشت سنی۔

اقبال نے ایک اور جرمن فلسفی گوئٹے کا بھی وسیع مطالعہ کیا ہے۔ وہ گوئٹے کے شہرۂ آفاق شاہکار ''فاوسٹ'' سے متاثر ہوئے ہیں۔ وہ کہتا ہے ''عمل خدا کے ساتھ تھا اور عمل ہی خدا

۱: جامع اردو انسائیکلوپیڈیا، 1، ادبیات، ص ۲۰۔

۲۔ ایضاً، ابن رشد، ص ص ۲۱، ۲۳۔

ہے'' اقبال گوئٹے سے کافی متاثر ہے۔

اقبال نٹشے کی طرف بھی جاتے ہیں۔ اس جرمن فلسفی نے اپنا نظام اخلاقیات ڈارون کے نظرے پر مرتب کیا ہے۔ وہ خدا کو نہیں مانتا، مگر نٹشے کا فوق البشر دیگر تمام انسانوں پر فوقیت رکھتا ہے۔ اگر چہ اقبال نٹشے کے نظریۂ الحاد اور دائرۂ تخلیق کو نا قابل قبول گرادنتا ہے، مگر پھر بھی اقبال نٹشے کے تصور ''فوق البشر'' سے بہت متاثر ہے۔

اقبال نے برگسان کا بھی غیر معمولی مطالعہ کیا اور وہ اس کے ہم عمر تھے۔ برگساں وجدان کے مکتب خیال سے تعلق رکھتے تھے۔ اقبال نے زمانے کے بارے میں برگساں کو حضورﷺ کی یہ حدیث سنائی کہ

لا تسبو الدھر فان الدھر ھو اللّٰہ

ترجمہ: زمانہ کو بُرا نہ کہو کیونکہ زمانہ ہی اللہ ہے۔

یہ حدیث سُن کر برگساں اُچھل پڑا۔[1]

اقبال نے افلاطون کی تعلیمات کو یکسر مسترد کر دیا، کیونکہ وہ لوگوں کو عمل کی حقیقت سے محروم کر دیتی ہیں۔ افلاطون کے نزدیک اسباب وعلل کی دنیا محض ایک فریب ہے اور وہ موت کو زندگی پر ترجیح دیتا ہے۔

اقبال کو زرتشت کے نظریات وتعلیمات میں حرکت اور عمل نظر آتی ہے۔ زرتشت کی تعلیمات کے مطابق خواہشات کا دروازہ اور تلاش وجستجو کی گرمی کاروانِ انسانیت کو آگے بڑھانے کے سب سے بڑے محرکات ہیں۔

اقبال نے مان (Mann) پر بھی توجہ مرکوز کی، جس نے بدھ مت، عیسائت، اور زرتشت کی تعلیمات کو یکجا کیا۔ وہ کہتا ہے کہ دنیا ساری برائیوں کا مجموعہ ہے۔ کائنات کو شیطان کے

۱: برہان، دہلی، دسمبر ۱۹۷۸ء، وقار احمد رضوی، فکر اقبال کے چند پہلو، ص ۴۳۔

بقول اُس کی سرگرمیوں نے جنم دیا۔

اقبال نے کارل مارکس کا بھی غیر معمولی مطالعہ کیا تھا، جو ایک بڑے مفکر اور فلسفی تھے۔ اقبال اُسکے بارے میں کہتے ہیں کہ ''نیست پیغمبر و لیکن در بغل دارد کتاب''۔ کارل مارکس مارکسزم کا بانی ہے۔

غرض کہ اقبال نے دنیا میں جہاں جہاں بھی علم کا کوئی چشمہ دیکھا، وہاں اپنی پیاس بجھائی اور تمام تر علوم کا مطالعہ کرنے کی کوشش کی۔ وہ تمام زندگی مطالعہ میں مصروف عمل رہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ خود بھی ایک عظیم شاعر اور مفکر و فلسفی تھے۔ اُن کی شخصیت ہمہ گیر ہے۔ ڈاکٹر انور سید رقمطراز ہیں۔

> ''حقیقت یہ ہے کہ اس دور میں انہوں نے مشرق و مغرب کے علوم سے کما حقہ، آگاہی حاصل کی، اپنے عہد سے قبل، گزری ہوئی تمام صدیوں کے زعمائے دانش سے تعلق خاطر پیدا کیا، ان کی تصنیفات کے مطالعے سے اپنے دیدہ و دل کو منور کیا اور اس روشنی سے وہ فلسفہ مرتب کیا۔ جو نشان راہ بھی تھا اور مقام منزل بھی ہے۔ چنانچہ اقبال شاید اردو کے واحد شاعر ہیں، جنہیں ان کی زندگی ہی میں شاعر اور مفکر تسلیم کیا گیا''۔[1]

اقبال اُن مفکروں اور دانشوروں سے بہت زیادہ متاثر رہے، جنہوں نے عمل اور حرکت پر زور دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال نے افلاطون جیسے عظیم مفکر کو مسترد کیا ہے۔ کیوں کہ اُس کی تعلیمات عمل اور حرکت سے محروم ہیں۔ اقبال حرکت پر زور دیتے ہیں۔ اُن کے نزدیک جس شخص میں تغیر ہو، وہی کامیاب ہوسکتا ہے۔ وہ زمانے کی قدر کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ زمانہ

۱: اقبالیات اُردو، اشاعت خاص، مدیر ڈاکٹر وحید قریشی، جولائی تا ستمبر ۱۹۹۴ء، جلد ۳۵، شمارہ ۲، ڈاکٹر انور سدید، اقبال اور اکیسویں صدی، ص ۲۳۔

اقبال کے ذہن میں ایک خاص اور بھرپور معنویت رکھتا ہے اور ان کی شاعری کا ایک اہم اور قوی کردار ہے ؎

زمانہ کہ زنجیر ایام ہے
دموں کے الٹ پھیر کا نام ہے

اقبال نے زندگی کو زمانہ کہا ہے اور زمانے کو زندگی اور ساتھ میں یہ بھی فرمایا ہے کہ یہ میں نہیں کہتا، بلکہ یہ فرمانِ نبیؐ ہے۔ یہ وہ تصور ہے، جو کائنات و تخلیق کا حرکی نقطۂ نگاہ پیش کرتے ہیں۔ اقبال کا یہی اندازِ فکر انہیں اس حدیث نبویؐ کی فلسفیانہ تعبیر کرنے کی ترغیب دلا گیا۔ یہ حدیث نبویؐ دو شکلوں میں دستیاب ہے۔

۱۔ لَا تسبّو الدّ ھر اَنّ الدّھر ھُو اللہ

۲۔ لَا تسبّو الدّھر فانی الدّھر

"جناب ابو ہریرہؓ سے روایت ہے، فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ آدم کا بیٹا (یعنی انسان) زمانہ کو بُرا کہہ کر مجھ کو تکلیف دیتا ہے۔ حالانکہ زمانہ میں ہی ہوں۔ میرے ہی ہاتھ میں سب کچھ ہے۔ میں ہی دن اور رات کو بدلتا رہتا ہوں" [۱]

مندرجہ بالا حدیث میں اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ وقت کو بُرا مت کہو، کیونکہ وقت میں ہی ہوں اور آگے یہ بھی کہتا ہے کہ میں ہی شب و روز کو بدلتا رہتا ہوں۔ یہاں پر اللہ تعالیٰ صاف الفاظ میں ایک انسان کو بدلنے کا موقعہ فراہم کرتا ہے کہ تو شب و روز کو بُرا بلا کہنے کے بجائے خود اپنے گریباں میں جھانک کے دیکھ کہ تو کیا کر رہا ہے، جبکہ تو جمود کا شکار ہو گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ صاف الفاظ میں تغیر اور تبدیلی کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن حکیم میں ایک جگہ فرماتا ہے کہ "میں

۱: مشکوٰۃ شریف کامل، اُردو، حدیث ۱۹، (یہ حدیث مبارک بخاری شریف، فتح الباری، ص ص ۶۹۲، ۶۹۳ پر بھی درج ہے)۔

اُس قوم کی حالت نہیں بدلتا نہ ہو خیال جس قوم کو اپنی حالت کے بدلنے کا''۔ گویا کہ تبدیلی خود بہ خود نہیں آتی ہے، بلکہ تبدیلی کیلئے ایک انسان کیلئے ضروری ہے کہ وہ اپنے آپ کو تبدیل کرے۔

اقبال تبدیلی کے بارے میں اور مذکورہ بالا حدیث کے بارے میں خواجہ غلام السدین کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''زمانہ ایک بڑی ہی برکت و نعمت ہے (لا تسبو الدھر ان الدھر ھو اللہ) اگر ایک طرف موت اور تباہی لاتا ہے، تو دوسری طرف وقت ہی آبادی و شادمانی کا منبع ہے۔ یہی اشیاء کے پوشیدہ امکانات کو بُروے کار لاتا ہے۔ حالاتِ حاضرہ میں تغیر کا امکان ہی انسان کی سب سے بڑی دولت اور ساکھ ہے''[1]

اقبال کے فلسفے کا اگر غور سے مطالعہ کیا جائے تو اقبال کے نزدیک زمان کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ انہوں نے حدیث پاک کے حوالے سے زمانے کو اہمیت دیکر خدا کا ہم معنی بنا دیا۔ اُن کے نزدیک زمانہ ہی تخلیق کا سرچشمہ ہے، تقدیر کا متبادل ہے، نہ صرف شاعری بلکہ اپنی شہرہ آفاق تصنیف ''تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ'' (Reconstruction of Religious Thought in Islam) میں بھی انہوں نے زمانے کے تصور کو بہت ہی تفصیل سے پیش کیا ہے۔ اس ضمن میں اقبال لا تسبو الدھر کی حدیث بھی بار بار نقل کرتے ہیں۔

زمانہ اقبال کے ذہن میں ایک خاص اور بھرپور معنویت رکھتا ہے۔ اقبال اُن قدیم مفکروں اور فلسفیوں سے اتفاق نہیں کرتے، جنہوں نے یونانی، جن میں خصوصیت کے ساتھ افلاطونی فکری روایت کے زیر اثر زمان کی حقیقت سے انکار کیا گیا تھا۔ افلاطون کی طرح ہسپانیہ کے دو بڑے فلسفی الکندی اور ابن سینا بھی زمانے کو غیر حقیقی مانتے ہیں۔ اقبال ان فلسفیوں سے متفق نہیں۔ اقبال کے نزدیک کائنات حقیقی ہے اس لئے زمان بھی حقیقی ہے، کیونکہ کائنات

۱: اقبال نامہ، حصہ اول، ص ۳۱۶۔

زمانے کے رشتوں میں برابر شریک ہے۔ اقبال کے نزدیک علم بھی زمانے سے ہی ماخوذ ہے۔ اقبال سقراط پر تنقید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ سقراط نے علم انسانی پر زیادہ زور دیا اور علم کائنات کو نظر انداز کر دیا۔ اسی طرح کی تنقید وہ افلاطون پر بھی کرتے ہیں، کیونکہ افلاطون زمان کی حقیقت سے انکار کرتے ہیں۔ اقبال کا تصور زمان برگساں، اسپنگلر اور الگزینڈر کے تصورات زمان سے قریب ہے۔ البتہ اقبال نفس یا انا یا خودی کو زمان پر مقدم مانتے ہیں۔

اقبال کے فلسفۂ زمان میں ''حرکت'' کا پہلو نمایاں ہے۔ وہ حرکت پر زور دیتے ہیں۔ اُن کے نزدیک حرکت سے ہی قوموں کے نصیب میں کامیابیاں آئی ہیں۔ اقبال کے یہاں حرکت ہی جدیدیت کے مترادف ہے، اُن کے ہر فلسفے میں حرکت کو پہلا مقام حاصل ہے، چاہے وہ زمان کا فلسفہ ہو یا پھر خودی کا، چاہئے وہ شاہین کا فلسفہ ہو یا پھر تسخیر کائنات کا۔ اُن کے ہر فلسفے میں حرکت پر خاص زور دیا گیا ہے۔

اقبال کے نزدیک اجتہاد بھی حرکت کا متبادل ہے۔ اپنے ایک خط بنام صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، میں لکھتے ہیں:

> ''میری ناقص رائے میں مذہب اسلام گویا زمانے کی کسوٹی پر کسا جا رہا ہے اور شاید تاریخ اسلام میں ایسا وقت اس سے پہلے کبھی نہیں آیا'' [1]

اقبال نے قرآن وحدیث کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور وہ انہیں اپنے فکر وفن کا ایک بہترین اور لازمی سرچشمہ سمجھتے ہیں۔ قرآن وحدیث سے انہوں نے یہ سبق دیا ہے کہ زمانہ کو بُرا مت کہو اور یہ سبق بھی دیا کہ ہر آن وہ ایک نئی شان میں ہے یا میں اس قوم کی حالت نہیں بدلتا نہ ہو خیال جس قوم کو اپنے اندر تبدیلی لانے کا۔ یہی وجہ ہے اقبال تبدیلی کی طرف زیادہ متوجہ ہوئے۔ اقبال چاہتے تھے کہ انسان بدل جائے اور اُن کا مشورہ یہ ہے کہ اگر زمانہ تمہاری مرضی کے مطابق نہ

۱: اقبال نامہ، حصہ دوم، ص ۵۱۔

چلے تو نہ سہی! تم اپنے آپ میں ایسی تبدیلی لاؤ کہ زمانہ خود بخود تمہارے ساتھ چلنے لگے

حدیث بے خبراں ہے تو با زمانہ بساز
زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ستیز

یہ بات بے خبروں کی ہے کہ زمانہ جیسے چلے ویسے چلو یا انسان کو زمانے کے ساتھ موافقت پیدا کرنی چاہیئے۔ یعنی جس طریقے کا ماحول اور حالات زمانہ میں ہوں ان کے مطابق زندگی گذارنی چاہیئے۔ اقبال اس مشورہ کو غلط قرار دیتے ہیں۔ ''زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ستیز'' یعنی اگر زمانہ تمہاری مرضی کے برخلاف ہو تو تم زمانے کی مرضی کے برخلاف ہو جاؤ۔ یہ ایک باغیانہ اور جُداگانہ فعل ہے۔ اور اقبال چاہتے بھی یہی ہیں۔ اس سے اقبال کے داخلی کرب اور جداگانہ فکر کی ترجمانی ہو جاتی ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ پھر کوئی حُسینؑ آئے اور بدی کی طاقتوں کو بُری طرح شکست فاش کر دے۔ اقبال ایک متحرک اور فعال آدمی کی تلاش میں تھے اور اقبال اس فعال آدمی کی تلاش میں ملک ملک کی خاک چھانتے رہے۔

اقبال کو معلوم تھا کہ یہ مٹی بنجر ہو چکی ہے، مگر وہ اس سے کبھی نا اُمید نہیں ہوئے، بلکہ اُنہیں امید ہے کہ اگر یہ مٹی ذرا نم ہو جائے تو بڑی زرخیز ثابت ہو سکتی ہے۔ اقبال مولانا جلال الدین رومؔی کے مرید تھے۔ رومؔی نے اپنے عہد کے صوفیانہ تصورات سے کنارہ کشی کی تھی، جو زندگی کو بے عملی کی راہ پر گامزن کر رہے تھے۔ رومؔی نے قنوطیت کے بجائے اُمید اور شک کے بجائے یقین کو اپنا موضوع بنایا۔ رومؔی کی تعلیمات میں جستجو اور عمل کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔ جب اقبال رومؔی کے رنگ میں رنگنے لگے، تو اُنہیں بھی عمل اور جستجو کا مقام سب سے بڑا نظر آنے لگا۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال نے ایک فعال اور حرکت پسند انسان کی تلاش شروع کی، کیونکہ رومؔی کو بھی اس فعال اور متحرک آدمی کی تلاش ہے جو فرشتوں، پیغمبروں اور خدا تک بھی پہنچ سکے اور رومؔی

کے مطابق عشق ہی وہ چیز ہے، جو انسان کو وہ مقام عطا کر سکتا ہے، جس کے ذریعے سے وہ تسخیر کائنات کر سکے، رومی کی طرح اقبال کے نزدیک بھی عشق ہی وہ شئے ہے، جس کے ذریعے انسان کو وہ قوت حاصل ہو سکتی ہے، جو پوری کائنات کی تسخیر کے لئے ضروری ہے۔

اقبال کے فلسفے کے مطابق بہتر عمل وہی ہے جس میں حقیقی عشق چھپا ہوا ہو۔ کیونکہ حقیقی عشق ہی بہتر عمل کرنے کیلئے مجبور کرتا ہے اور اقبال کے نزدیک جس نے بھی بہتر عمل کر دکھایا اس کے اس عمل میں عشق پوشیدہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال نے حضرت ابراہیمؑ کے آگ میں ڈالے جانے کو عشق سے تعبیر کیا ہے ؎

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

عقل کا تقاضا یہ ہے کہ آگ اپنی فطری صفت کی بناء پر انسان کو جلاتی ہے۔ پھر حضرت ابراہیمؑ کیلئے تیار کی گئی آگ ایک غیر معمولی آگ تھی، جس کو تیار کرنے میں برسوں صَرف ہوئے اور آگ کو تیار کرنے کے دوران حضرت ابراہیمؑ کو یہ سمجھانے کی کافی کوشش کی گئی کہ آپؑ نمرود کی خدائی کو تسلیم کریں۔ مگر اُنہوں نے صاف انکار کیا اور بے خطر اس کی تیار کرائی گئی آگ میں کود پڑے۔ اگر حضرت ابراہیمؑ عقل سے کام لیتے تو وہ آگ میں کسی بھی قیمت پر کود نہیں پڑتے۔ مگر یہ عشق کا معاملہ تھا جس نے ابراہیمؑ کو یہ عمل کرنے پر مجبور کیا۔[1]

اقبال کی نظم و نثر دونوں میں حرکت یا عمل کو پہلا مقام حاصل ہے۔ اُنہوں نے ساری دنیا کو چھان مارا اور ہمیشہ ہندوستان کے عوام کی بے عملی کو ختم کرنے کے طریقے تلاش کرتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال اُن تمام مفکروں اور دانشوروں کو خراج پیش کرتے ہیں، جنہوں نے

۱۔ حضرت ابراہیمؑ نمرود کی تیار کی گئی آگ میں کود نہیں پڑے، بلکہ آپؑ آگ میں ڈالے گئے۔ اقبال کے لفظ ''کود'' لکھنے کا مقصد یہاں یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے عشق کی انتہا یہ تھی کہ وہ ذہنی طور پر آگ میں کودنے کیلئے تیار تھے۔

عمل اور حرکت پر زور دیا ہے۔ اقبال ان تمام دیواروں اور زنجیروں کو توڑنے کی تلقین کرتے ہیں، جنہوں نے انسان کو جکڑ کر اُسے بے عمل بنا رکھا ہے۔ اقبال نے صاف اور واشگاف الفاظ میں یہ بات کہہ دی ہے کہ انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے نہ بُرا ہے نہ اچھا ہے، وہ اس دنیا میں جیسے اعمال کرتا ہے ویسا ہی ہو جاتا ہے اور اپنے لئے جنت یا جہنم کے دروازے کھول دیتا ہے۔ انسان پیدائشی طور پر گناہوں سے پاک ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ کسی قسم کا گناہ نہیں ہوتا، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کے اچھے اور برے کاموں کا دارومدار اُس کے اعمال پر ہوتا ہے۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

اقبالؔ کے فلسفے کے مطابق پیہم عمل کرنے ہی سے دنیا کو جیتا جا سکتا ہے۔ اقبال ایسا عمل چاہتے ہیں، جو ہر طرح کی رکاوٹوں سے آزاد ہو۔ وہ عمل کی آزادی کے سب سے بڑے علمبردار ہیں، کیونکہ اُن کے نزدیک انسان کو آزادی حاصل ہے کہ وہ کس طرح کا عمل کرے اور اپنی آنے والی زندگی یا اپنا مستقبل تعمیر کرے۔ اقبال اُن تمام مفکروں اور دانشوروں کے ساتھ ساتھ ایک سنگ تراش کوہکن کے کام کو بھی تسلیم کرتے ہیں، جس نے اپنی محبوبہ کو پانے کیلئے ایک اُونچے پہاڑ کا جگر چیر ڈالا۔ اقبال کے مطابق اس کوہکن کے کام میں حرکت اور عمل نمایاں ہے۔ وہ اس فلسفۂ عشق و عمل کی وضاحت یوں کرتے ہیں

زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ
جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی

مندرجہ بالا شعر میں اقبالؔ نے ایران کے ایک مشہور عاشق فرہاد کے عشق کا خاکہ کھینچا ہے، جو ایک ملکہ ''شرین'' کے عشق میں مبتلا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ایران کے بادشاہ پرویز نے فرہاد

سے یہ وعدہ کیا تھا کہ اگر تم پہاڑ کے اس طرف سے بہنے والی نہر کو میرے محل تک لانے میں کامیاب ہو جاؤ گے تو اس کام کے بدلے میں تم شیرین کو پا سکتے ہو۔ فرہاد کو شرین سے اس قدر عشق تھا کہ اس نے عملی طور اسے کر دکھایا۔ اقبال کے نزدیک فرہاد ایک ایسا عاشق ہے، جس نے محبت اور محنت کی بدولت کامیابی حاصل کی۔ اسی طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ محبت میں کامیابی پانے کیلئے محنت یا عمل ضروری ہے۔ اگر عمل نہ ہو، تو ردِ عمل بھی ناممکن ہے۔

اقبال کو ایک فعال آدمی کی تلاش تھی جو محنت و مشقت پر انحصار کرتا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال نے فرہاد کو سراہا ہے۔ کیونکہ اس کے کام میں حرکت کو اولیت حاصل ہے اور وہ قیس کی طرح مجنون نہیں بنتا اور صحراؤں میں بھٹکنا پسند نہیں کرتا بلکہ فرہاد کے عشق میں عمل نمایاں ہے جبکہ قیس کے عشق میں دیوانگی نظر آتی ہے۔ اقبال قیس کے سوز دروں کے ٹھنڈے ہو جانے پر تعجب کرتے ہیں۔ "تضمین بر شعر انیسی شاملو" میں کہتے ہیں ؎

تیرا اے قیس کیونکر ہو گیا سوزِ دروں ٹھنڈا
کہ لیلیٰ میں تو ہیں اب تک وہی انداز لیلائی

اقبال تعجب اس بات پر کرتے ہیں کہ لیلیٰ کے انداز میں وہی دلکشی اور خوبصورتی موجود ہے جو اس سے پہلے تھی، لیکن اے قیس تیرے اندر حرکت کی صلاحیت موجود نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تو حواس باختہ ہو گیا۔ جبکہ تیرے مقابلے میں فرہاد پیہم عمل میں مصروف ہے اور اس کے اندر حرکت کی صلاحیت موجود ہے۔

اقبال عشق اور عمل کو زندگی کا وہ خزانہ مانتے ہیں، جس پر موت حرام ہے۔ اس کے نزدیک محبت اور حرکت ہی زندگی کو جاوداں بناتی ہے۔ زندگی میں جب دشواریاں پیدا ہوتی ہیں تو ان دشواریوں کو دور کرنے کیلئے عشق اور عمل دونوں کی آمیزش کام آتی ہے، بلکہ اقبال حرکت

اور عمل کو عشق کے مترادف قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک عشق کے بغیر عمل بے ذائقہ اور حرکت کے بغیر محبت بے سود، اور جب تک ان دونوں میں یکسانیت پیدا نہ ہو جائے، تب تک معرکۂ بدر و حنین، ابراہیمؑ کا آتش نمرود میں کود پڑنا، مسجد قرطبہ کا تعمیر ہونا، وغیرہ وغیرہ ناممکن ہوتا۔ ان تمام کے پیچھے عشق اور عمل کا یکساں ہونا نمایاں نظر آتا ہے۔ اقبال چاہتے تھے کہ انسان تمام مزاحمتوں پر غلبہ پائے، یہ تبھی ممکن ہوسکتا ہے، جب انسان اس کو عملی طور کر دکھائے۔ مگر انسان عملی طور تب تک ان مزاحمتوں پر غلبہ حاصل نہیں کرسکتا جب تک نہ اس میں جذبۂ عشق کارفرما ہو۔ اقبال عشق کو خون جگر سے تعبیر کرتے ہوئے کہتے ہیں ۔

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

اقبال ہر اس کام کو مسترد کرتے ہیں، جس میں خونِ جگر یعنی عشق شامل نہ ہو۔ یہی فلسفہ اقبال کو ایک نیا شاعر بناتا ہے۔ کیونکہ اُن کے فلسفۂ عشق میں رہبانیت نہیں ہے۔ بلکہ اس کا فلسفۂ عشق حرکت اور انقلاب کا نظریہ پیش کرتا ہے۔ اقبال نے عشق کے اس حرکی اور انقلابی نظریے کو پیش کر کے تاریخ، تمدن اور سماج میں ایک نیا انقلاب بپا کیا۔ اس طرح سماج میں تبدیلیاں رونما ہونے لگیں۔ کیونکہ سماج سکوت پسند بن گیا تھا اور وہ تبدیلیوں کو پسند نہیں کرتا تھا مگر اقبال کی بانگِ درا نے اسے تبدیل ہونے پر مجبور کیا۔ اقبال کے عشق و عمل کا یہ فلسفہ، جس نے سماج میں ایک بڑا انقلاب لانے میں کافی مدد کی، کی نسبت پروفیسر عالم خوندمیری لکھتے ہیں:

> ”۔۔۔ وہ (اقبال) تکوین اور تغیر کے عمل میں حقیقت کی تلاش کرتا ہے اور غیر تبدیل پذیر وجود میں نہیں کرتا، وہ روایتی سکوت پرور ذہن کے برخلاف سعیِ مسلسل کو وجود کے مفہوم کا حامل قرار دیتا ہے اور سب سے بڑھ کر جدید تر کی تلاش میں

تاریخ کے ہنگامہ خیز بہاؤ میں کود پڑنے کو ترجیح دیتا ہے۔ جسے وہ شاعرانہ زبان میں عشق کی جست کے نام سے یاد کرتا ہے۔ اسی نقطۂ نظر سے اقبال عشق میں جدیدیت اور عصریت کی آواز بن جاتا ہے''۔[1]

اقبالؔ نے اپنی شاعری کو سماجی تبدیلی کا مظہر بنایا۔ وہ جانتے تھے کہ سماجی تبدیلی کے بغیر تہذیبی تبدیلی ممکن نہیں۔ جب تک معاشرے کی موجودہ سماجی ترتیب برقرار ہے، تب تک ثقافتی اور تہذیبی فروغ کا عمل ممکن نہیں ہے۔ جب یہ ترتیب تبدیل ہو جائے گی، تو اقدار بھی تبدیل ہونگیں اور اقدار بدلنے سے تہذیبی انقلاب شروع ہوگا۔ مگر یہ عمل تبھی ممکن ہے، جب اس کے اندر عشق کا جذبہ پیدا ہو جائے۔

اقبال کے فلسفہ کے ساتھ عشق کا وابستہ ہونا لازمی امر ہے۔ حرکت، خودی، شاہین، مردِ مومن، تسخیر کائنات، حیات، عقل، پیکار، حریت، یا پھر اور کوئی فلسفہ ہو، جب تک نہ اس فلسفے کے ساتھ عشق کا فلسفہ ہو، تب تک اس میں وہ گرمی نہیں رہتی جو گرمی عشق فراہم کرتا ہے۔

بقول اقبالؔ ؎

فرشتہ تھا اک عشق تھا نام جس کا
کہ تھی رہبری اس کی سب کا سہارا

اقبال کی شاعری اور نثر دونوں میں حرکت پر زیادہ زور ملتا ہے۔ اُنہیں کاہل انسان پسند نہیں، بلکہ وہ اُسے متحرک ہونے پر اُکساتا ہے۔ تاکہ اس کی یہ مختصر زندگی قوم کیلئے ایک تحفہ ثابت ہو۔ اقبالؔ اسے یوں سمجھاتے ہیں ؎

۱: انسانی تقدیر اور وقت، فکر اقبال (مقالات حیدرآباد سمینار)، مرتب عالم خوندمیری، ڈاکٹر مغنی تبسم، ص ۲۵۴۔

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

حرکت قدرت کے کارخانے کو بہتر بنانے میں راہیں ہموار کرتی ہے۔ غور کریں تو ہمیں اپنے اِردگرد کچھ چیزیں منجمد اور کچھ متحرک نظر آئیں گے۔ ان میں سے متحرک چیزوں کی تعداد منجمد چیزوں کے مقابلے میں بہت زیادہ ہوگی۔ زندگی کا تعلق وقت سے ہے اور کسی بھی حالت میں کائنات کے زمانی اور مکانی فاصلے طے کرنے پڑتے ہیں اور ان فاصلوں کو بڑھانے میں جو چیز کارفرما ہے وہ جمود ہے اور جو چیز فاصلوں کو طے کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہے وہ حرکت ہے۔

اقبال کا کلام نئی نسل کو متحرک ہونے کی ترغیب دیتا ہے۔ اس میں دورائیں نہیں کہ اقبال ایک انقلابی دانشور تھے۔ اُن کا نظریہ یہ ہے کہ متحرک یا انقلاب کی کشمکش سے بھرپور زندگی کامیاب زندگی ہے اور غیر متحرک زندگی ناکام زندگی ہے۔ کہتے ہیں ؎

موت ہے وہ زندگی جس میں نہ ہو انقلاب
روحِ اُمم کی حیات کشمکش انقلاب

اقبال نے مسلمانوں کے حالات کو دیکھ کر ہی یہ شعر کہا ہوگا، کیونکہ مسلمانوں میں کاہلی پیدا ہوگئی تھی۔ اقبال اُنہیں متحرک دیکھنا چاہتے تھے اور اُن کے اندر انقلاب پیدا کرنا چاہتے تھے۔ مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کیلئے قرآن فہمی اور تعلیم کا انقلاب لانا چاہتے تھے، جیسا کہ پروفیسر مشیر الحق مرحوم لکھتے ہیں:

''اقبال مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کی تمنا میں جیئے بھی اور مرے بھی۔ اس نشاۃ ثانیہ کیلئے جس قسم کے ذہنی انقلاب کی ضرورت تھی وہ اقبال کے خیال میں صرف فہم قرآن کے ذریعے پیدا ہوسکتی تھی''[1]

1: تشخص کی تلاش کا مسئلہ اور اقبال، (مرتب: آل احمد سرور)، ص ۴۰۔

اقبال کو یہ معلوم تھا کہ اگر مسلمان قرآن کا مطالعہ سنجیدگی کے ساتھ کریں، یعنی جب قرآن کی گرہ کشائی رازی اور کشاف کے بجائے یہ ٹھہرے کہ قرآن کا نزول خود اُن کے اپنے ضمیر پر ہو، اس سے ایک عام مسلمان اُن روایتی ملاؤں سے چھٹکارا پا سکتا ہے، جنہوں نے مسلمانوں کو قرآن کی صحیح تعلیمات سے آگاہ نہیں کرایا اور جب قرآن اپنے صحیح مفہوم میں اُن تک پہنچایا جائے، ان کے اندر ضرور انقلاب آئے گا اور اس طرح سے تبدیلی کا ہونا لازم بن جاتا ہے۔ اقبال نے اپنے اشعار میں جگہ جگہ اور اپنے خطبات کے علاوہ اپنے مکتوبات میں بھی قرآن فہمی کا ذکر کیا ہے۔ ان کا مقصد صرف یہ تھا کہ لوگ اصل دین سے واقف ہوں۔

اقبال نے قرآن کا گہرائی کے ساتھ مطالعہ کیا تھا۔ اُنہیں معلوم تھا کہ قرآن انسان کو تغیر پسند اور جدید طبع بناتا ہے۔ جیسا کہ وہ اپنے چوتھے خطبے میں رقمطراز ہیں:

> ''اس سلسلے میں غور طلب امر قرآن مجید کا وہ مطمح نظر ہے، جو اس نے زندگی کے بارے میں قائم کیا اور جس میں اس کی نگاہ جمود کے بجائے حرکت پر رہی، لہٰذا ظاہر ہے جس کتاب کا مطمح نظر ایسا ہوگا مطمح اس کی روشنی ارتقاء کے خلاف کیسے ہو سکتی ہے''۔[1]

اقبال اُس کتاب مبین کی بات کرتے ہیں، جس پر اسلام کی بنیاد قائم ہے، جب قرآن کا نظریہ جمود کے بجائے حرکت ہے تو اس کے معنی یہی ہیں کہ اسلام ایک تغیر پسند مذہب ہے۔ اقبال قرآن، اپنے شاندار ماضی اور اسلاف کے کارناموں کے حوالے سے کھوئی ہوئی عظمت کو دوبارہ حاصل کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ اُنہیں اس بات کا احساس ہے کہ نئی نسل نے اس ماحول میں پرورش پائی ہے، جو لادینیت پر قائم ہے اور جس میں ملاؤں کا کافی اثر و رسوخ ہے۔ لیکن اقبال نوجوانوں کو بدلنے کا سبق دیتے ہیں ؎

۱: نذیر نیازی (مترجم)، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ (علامہ اقبال)، ص ۲۱۷۔

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر
نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر

یہی وہ حوصلہ ہے، جو اقبال نئی نسل کو دیتے ہیں، کیونکہ نئی نسل کی حالت یہ ہے کہ اُن کے ہونٹ پیاسے اور ان کے جام ذوق وشوق کی شراب سے خالی ہیں۔ چہرے اور دماغ تو روشن، مگر دل میں زنگ لگ چکا ہے۔ اسی لئے دل تاریک ہیں۔ کم نگاہی، بے یقینی اور نا اُمیدی نے ان کی نظروں سے اصلیت غائب کردی ہے۔ نئی نسل بجائے خود کے غیر پر اعتماد کررہی ہے۔ کلیسا حرم کی تفریق میں اس طرح مصروف ہے کہ خود حرم والوں کو یہ پتہ نہیں کہ یہ کیا ہورہا ہے۔ اسلامی تعلیمی ادارے خصوصاً دینی مدرسے اپنے مقصد سے بیگانہ ہیں۔ ان مدارس کے طلباء اصل علم سے بیگانہ ہیں۔ ملاؤں اور مذہب کے ٹھیکہ داروں نے ذاتی اور وقتی مفاد کے عوض دین و ملت دونوں کو فروخت کردیا ہے۔ غیر اسلامی تصوف سے نوجوان بگڑ گئے ہیں اور اس طرح نئی نسل راہبانہ ذہن اختیار کررہی ہے۔ اقبال کو معلوم ہے کہ اس سے نئی نسل اصل اسلام سے دور ہوجائے گی۔ اسلام تغیر اور تبدیلی کا سبق دیتا ہے، نہ کہ راہبانہ زندگی کا۔ اقبال زندگی کو ہر وقت جواں اور پیہم دواں سمجھتے ہیں۔ ''بانگ درا'' کی ایک نظم ''زندگی'' میں ایک جگہ کہتے ہیں ؎

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں پیہم دواں ہر دم جواں ہے زندگی

اقبال نئی نسل سے مخاطب ہوکر کہتے ہیں کہ جو یہ زندگی آپ کو دی گئی ہے، یہ زندگی صرف مرنے اور جینے کا نام نہیں ہے۔ زندگی محض چند سال زندہ رہنے یا نفس شماری کا نام نہیں، بلکہ اس تصور سے بالاتر ایک بڑی حقیقت ہے۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو کب کے مٹی میں سو چکے ہیں لیکن اپنے کام کی وجہ سے آج تک زندہ ہیں اور کچھ لوگ جو زندہ ہیں، مگر لگتا ہے کہ انہوں نے جنم

بھی لیا تھا یا نہیں۔

اقبال زندگی کو کلینڈر کے پیمانوں سے ناپنے سے بیزار ہیں۔ یہ دنوں اور راتوں سے بالا تر ہے۔ زندگی ایک دائمی حقیقت ہے زمانہ اس کو فنا نہیں کر سکتا ہے، کیوں کہ یہ ایک پیہم حرکت کا نام ہے۔ زندگی اصل میں ایک جوش اور ولولہ کا نام ہے، جس کی بدولت وہ ظہور کیلئے بیتاب رہتی ہے اور اس جہاں میں وہی زندہ ہے جو اللہ کی طرح 'کن' کہہ کر نئی دنیا پیدا کر سکے۔

اقبال نے اپنے فلسفۂ حیات میں بنیادی حیثیت 'حرکت' کو ہی دی ہے۔ جو حرکت کرے گا وہی طاقتور بن جائے گا اور صرف طاقتور ہی اپنے ماحول کی تخلیق اور حفاظت کر سکتا ہے۔ اس کی بجائے کمزور خود کو ماحول کے مطابق ڈھالنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

اقبال کو قوت میں یہ صفت نظر آتی ہے کہ قوت باطل کو چھو لیتی ہے، تو باطل حق میں بدل جاتا ہے۔ اقبال کے نزدیک جس کے پاس عشق ہے، اس کے پاس عمل بھی ہے اور جس کے پاس یہ دونوں ہیں اس کے پاس طاقت ہے اور طاقت حق کا عمل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال پرندوں میں شاہین کو درویش کہہ کر اُسے بلند مقام عطا کرتے ہیں۔ وہ انسان کو شاہین کی طرح جینے کی ترغیب دیتے ہیں۔ اقبال ایک عظیم مفکر تھے۔ اُن کی نظر بلندیوں پر تھی، وہ انسان کو ان بلندیوں پر دیکھنا چاہتے ہیں، جہاں بقول اقبالؔ

خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے؟

اقبال کی نظر ستاروں سے آگے کے جہانوں پر ہے، لہٰذا انہوں نے فضائے بسیط کی تسخیر کیلئے شاہین کی علامت اختیار کی ہے۔ تصورات اقبال میں ہم دیکھتے ہیں کہ حرکت و عمل اور قوت و طاقت کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے اور اقبال کی اس علامت ''شاہین'' میں یہ تمام صفات موجود ہیں۔ شاہین دوسرے کا حق نہیں مارتا اور نہ ہی دوسرے کے ہاتھ کا کیا ہوا شکار کھاتا ہے، بلکہ

خودشکار کرتا ہے، اونچائی پر رہنا پسند کرتا ہے، مگر آشیانہ نہیں بناتا۔ اقبال اس کو ہر وقت متحرک پاتے ہیں ؎

جھپٹنا، پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا
لہو گرم رکھنے کا ہے اِک بہانہ

اقبال کا خیال ہے کہ حرکت صفاتِ الٰہیہ میں سے ہے اور بندے کا فرض ہے کہ وہ خود کو اس صفت سے متصف کرے۔ جب وہ قرآن فہمی کا ذکر کرتے ہیں تو اُنہیں معلوم ہے کہ قرآن ہمیں نئے ڈھنگ سے زندگی جینے کا مشورہ دیتا ہے۔ (سورۃ ۵۵ آیت ۲۹)

فریبِ خطر ہے سکون و ثبات
تڑپتا ہے ہر ذرۂ کائنات

ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود
کہ ہر لحظہ تازہ ہے شانِ وجود

یہ ندرت فکر و عمل یا ذوقِ انقلاب جس کا ذکر اقبال کے یہاں بار بار آتا ہے، اُن کے اس عقیدے کا جزو لائنفک ہے کہ زندگی جامد و ساکت نہیں بلکہ نامیاتی اور حرکی ہے۔ اقبال ایک مفکر اور دانشور تھے۔ اُن کا مطالعہ نہایت وسیع اور گہرا تھا۔ اُنہوں نے ہرقلیطوس اور آینسٹائن کا بھی گہرا مطالعہ کیا تھا۔ اُنہیں یقین تھا کہ حرکت میں برکت ہے۔ آئنسٹائن اور آیزک نیوٹن سے اُن کی دلچسپی سائنس سے اقبال کی دلچسپی کا پتہ دیتی ہے۔ جیسا کہ پروفیسر محمد حسن رقمطراز ہیں:

''سائنس سے اقبال نے قوت اور توانائی اور عمل اور جہدِ مسلسل کے معنی سیکھے''۔[1]

ا: اقبال۔ مذہب اور سائنس، فکرِ اقبال (مقالات، حیدرآباد سمینار)، مرتبین ڈاکٹر عالم خوندمیری، ڈاکٹر مغنی تبسم، ص ۲۴۰۔

سائنس سے دلچسپی کی بناء پر اقبال، ''تڑپتا ہے ہر ذرۂ کائنات'' کا نظریہ پیش کرتے ہیں۔ ذرہ کا لفظ اقبالؔ نے اس لئے استعمال کیا ہے۔ کیونکہ یہ آخری حد ہے۔ اس کے بعد اس سے چھوٹی اور کوئی شئے نہیں ہے۔ ذرے کو انگریزی میں ایٹم (Atom) کہتے ہیں۔ لفظ ایٹم یونانی زبان کا ایک لفظ ہے جس کے معنی ہے، ''نہیں کاٹ سکتا'' یعنی ذرے کو اور چھوٹا نہیں کاٹا جا سکتا ہے۔ اس کو انسانی آنکھوں سے نہیں دیکھا جا سکتا ہے اور نہ ہی عام خوردبین سے بلکہ جدید سائنس نے ذرے کو دیکھنے کیلئے ایک جدید ترین خوردبین تیار کی ہے۔ جس کو Scanning Tunneling Microscope (STM) کہا جاتا ہے۔ اس کے ذریعے ایٹم کو براہِ راست زندہ دیکھا جا سکتا ہے۔ ذرّے کی اندرونی اور بیرونی بناوٹ سے ایسا لگتا ہے کہ ذرہ بھی قابل تقسیم ہے۔ مگر ذرہ اپنے وجود میں ابھی بھی ایک نا قابل تقسیم اکائی ہے۔ اگر ایک ذرہ کے نیوٹرون، الیکٹرون اور پروٹان الگ الگ کرنے کی کوشش کی جائے، اس صورت میں ذرۂ بحیثیت ذرہ باقی نہیں رہ سکتا۔

ہر ذرّے میں ایک نظم ونسق قائم ہوتا ہے۔ الیکٹران جسامت میں سب سے چھوٹا ہوتا ہے اور بجلی کا منفی چارج (Negative Charge) رکھتا ہے۔ پروٹان جسامت میں الیکٹران سے تھوڑا بڑا ہوتا ہے اور بجلی کا مثبت چارج (Positive Charge) رکھتا ہے۔ نیوٹران کی جسامت پروٹان کے برابر ہی ہوتی ہے، مگر یہ کسی بھی چارج کا حامل نہیں ہوتا ہے۔

ذرّے کے بالکل بیچ میں پروٹان اور نیوٹران مل کر مرکزہ (Nucleus) بنائے رکھتے ہیں۔ اس مرکزہ کے گرد اتنے ہی الیکٹران گردش کرتے رہتے ہیں، جتنے اس ذرے میں پروٹان ہوتے ہیں۔ ہر ذرے کے پروٹان اور نیوٹران برابر نہیں ہوتے ہیں۔ ان کی تعداد مختلف ہوتی ہے۔ مختصراً یہ کہ الیکٹران، پروٹان اور نیوٹران مل کر ذرہ یا جوہر یا ایٹم بناتے ہیں، جس کی وجہ سے ذرے کو اور چھوٹا نہیں کیا جا سکتا۔ ایس، ٹی، ایم (STM) سے دیکھے جانے والے ان ذرات سے ہی کائنات کی آفرینش ہوئی ہے۔ اقبال جواہر کے بارے میں اپنے تیسرے خطبے میں

رقمطراز ہیں:

''اشاعرہ کے نزدیک قدرت کاملہ الٰہیہ کا منہاج تخلیق جوہر کی آفرینش ہے۔۔۔
اشاعرہ کے نزدیک کائنات کی ترکیب جواہر، یعنی ان لاانتہا چھوٹے چھوٹے
ذروں سے ہوئی، جن کا مزید تجزیہ ممکن ہے''۔[1]

اقبال ''ضربِ کلیم' کی نظم ''نگاہ شوق'' میں فرماتے ہیں:

یہ کائنات چھپاتی نہیں ضمیر اپنا
کہ ذرہ ذرہ میں ہے ذوقِ آشکارائی

ہر ذرّے میں، الیکٹران حرکی توانائی (Kinetic Energy) رکھتے ہیں یا پیدا کرتے ہیں۔ اور اسی توانائی کی وجہ سے مرکزہ (Nucleus) کے گرد تھوڑی سی دوری پر بڑی تیزی سے گھومتے ہیں۔ الیکٹرانوں کے بارے میں اسی لئے جدید سائنس اب بھی یہ صاف پتہ نہیں لگا پائی کہ یہ واقعی ذرات ہیں یا توانائی کا مظہر (Energy Wave)؟ جو کچھ بھی ہے، یہ ہر وقت اپنے مرکز کے گرد گھومتا رہتا ہے، کبھی بھی رکنے کا نام نہیں لیتا۔ ہر ذرے کے پروٹان اور الیکٹران کی تعداد مساوی ہوتی ہے۔ ان کی کیمیائی خصوصیت بھی مخصوص ہوتی ہے اور اسی بنیاد پر یہ کیمیائی تعاملات میں حصہ لیتے ہیں۔ اسی طرح مرکزے میں پروٹان اور نیوٹران ایک مخصوص تناسب میں رہتے ہیں اور اپنے کام میں مصروف عمل ہوتے ہیں۔

پروفیسر محمد حسن عرفی اور اقبال کا حوالہ دیتے ہوئے، ذرے کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

''عظیم اور اعلیٰ شاعر کی آواز اسی کے وطن اور علاقے اس کی زبان اور تہذیب حتیٰ
کہ اس کے دور کی سرحدیں پار کرتی ہوئی اگلی نسلوں تک جا پہنچتی ہے۔ اس ابدیت
کے پانے کیلئے شاعر اپنے عصری مسائل بھی اپنے تجربے اور اظہار سے آفاقیت اور

۱: مترجم: سید نذیر نیازی، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، (علامہ اقبال)، ص ۱۳۸، ۱۳۹۔

عمومیت پیدا کرتا ہے۔اس کا بنیادی موضوع بقول عرفی وہ ذرّہ ہے، جو کائنات کے بے کراں خلا میں عالم سرشاری میں رقص کر رہا ہے اور اپنی آستین پھیلا لینے بھر کی بھی وسعت اور فراخی نہیں پاتا۔اقبال کی شاعری کا موضوع بھی یہی ذرّہ ہے۔''[1]

اس کائنات، جس کی وسعت کا اندازہ لگانا بے حد مشکل ہے، کائنات کی سب سے چھوٹی چیز کی دریافت سے پتہ چلتا ہے کہ اس سے چھوٹی چیز ملنا تقریباً ناممکن ہے اور اس چھوٹی سی چیز کے بارے میں عرفی کہتا ہے کہ یہ عالم سرشاری میں رقص کر رہا ہے اور جدید سائنس نے جب ایس، ٹی، ایم(STM) کے ذریعے ذرّے کی جانچ کی تو یہی پایا کہ یہ رقص میں ہے اور ہمیشہ متحرک رہتا ہے اور بقول اقبال

تڑپتا ہے ہر ذرّۂ کائنات

جدید سائنس کا جب مطالعہ کیا جاتا ہے، تو یہی پتہ چلتا ہے کہ ہر شئے کی آخری حد یعنی جس حد سے اس شئے کو نہیں کاٹا جا سکتا اور جو ذرہ کہلاتا ہے، وہ آخری حد یا ذرہ ہمیشہ تڑپتا یا حرکت میں رہتا ہے۔ یہ اُس چیز کی سچائی ہے، جس کی حقیقت انسانی آنکھ یا عام خوردبین براہ راست نہیں کر سکتی، مگر یہ چھوٹا ذرہ غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔اقبال اس ذرے کی حقیقت کے بارے میں رقمطراز ہیں:

"What is the character and general structure of the universe in which we live? Is there a permanent elemens in the constitution of this universe? How are we related to it? What place do we occupy in it, and what is the kind of conduct that befits the place we occupy? These questions are common to religion, philosophy and higher poetry.[2]

ترجمہ: یہ عالم جس میں ہم رہتے ہیں اس کی نوعیت کیا ہے اور ترکیب کیا؟ کیا اس کی ساخت میں کوئی دوامی عنصر موجود ہے؟ ہمیں اس سے کیا تعلق ہے اور ہمارا اس میں کیا مقام ہے؟ باعتبار اس مقام کے ہمارا طرزِ عمل کیا ہونا چاہیے۔ یہ سوالات ہمیں جو مذہب، فلسفہ اور اعلیٰ شاعروں میں مشترک ہیں''۔[3]

۱: اقبال۔مذہب اور سائنس، فکر اقبال (مقالات، حیدرآباد سمینار)، مرتبین عالم خوندمیری، ڈاکٹر مغنی نسیم، ص ۲۶۴۔

2. Reconstruction of Religious Thought in Islam, (Edited by Mohd Syed Sheikh), P.1

۳۔ مترجم سید نذیر نیازی، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، محمد اقبال، ص ۴۱۔

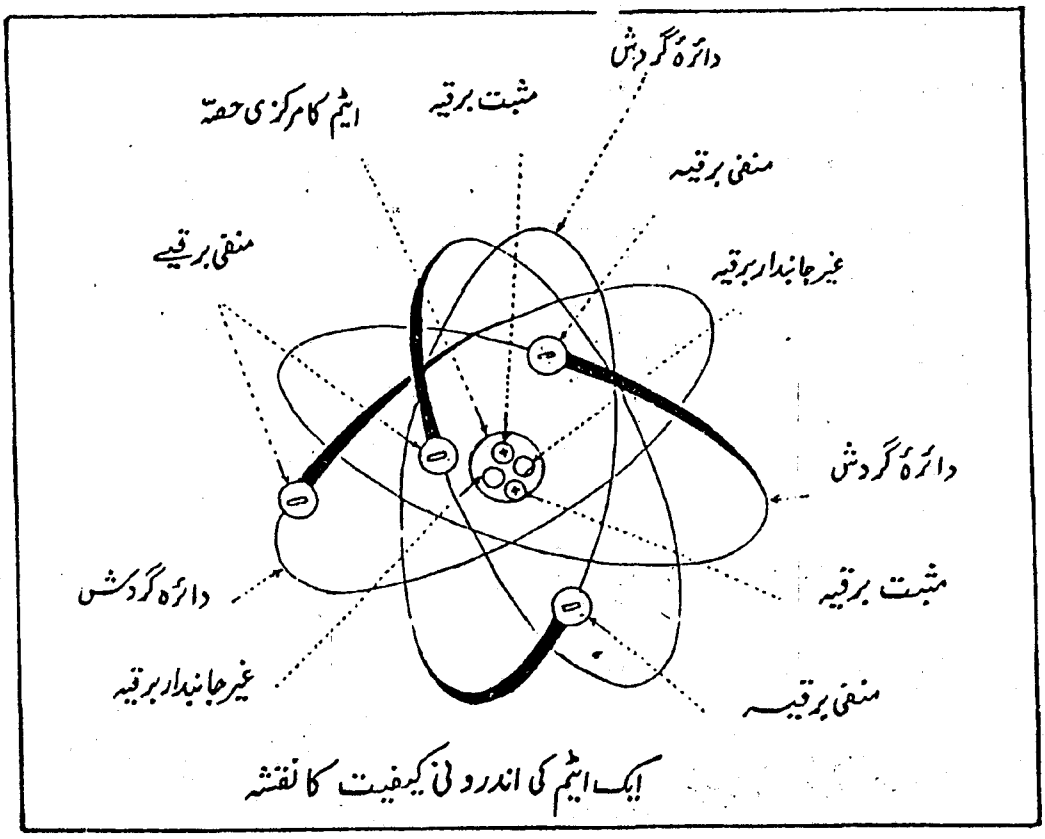

ایک ایٹم کی اندرونی کیفیت کا نقشہ

بحوالہ: ماہنامہ، سائنس، نئی دہلی، جلد ۵، شمارہ ۱۱، نومبر ۱۹۹۸ء، ایڈیٹر محمد اسلم پرویز، ص ۹۔

ایس، ٹی، ایم، کے ذریعے دیکھے گئے، ایک جوہر کی اندرونی کیفیت، جو بقول عرفیؔ ''عالمِ سرشاری میں رقص کر رہا ہے'' اور انسانی آنکھ سے براہِ راست نہ دیکھے جانے والے اس جوہر کے مسلسل تغیر کی حقیقت اقبال نے یوں بیان کی ہے

حقیقت ایک ہے ہر شے کی خاکی ہو کہ نوری ہو
لہو خورشید کا ٹپکے، اگر ذرّے کا دل چیریں

مندرجہ بالا اقتباس میں اقبال نے جہاں کائنات کی نوعیت، ترکیب اور کائنات کے ساتھ انسان کے تعلق کے بارے میں سوالات اُٹھائے ہیں وہیں کائنات کی ساخت میں ذروں کے کردار کے بارے میں بھی سوچنے کی ترغیب دی ہے۔ان سوالات کو پیش کرنے کے بعد ایک بہترین سوال وہ یہ کرتے ہیں کہ ہمارا طرزِ عمل کیا ہونا چاہیے؟

اس سوال سے پہلے اقبال کئی سوالات اُٹھاتے ہیں جیسے کائنات کا وجود کیوں اور کن بنیادوں پر ہوا؟ انسان کو اس جہاں میں کیوں بھیجا گیا اور عناصر کا کائنات کی ساخت میں کیا عمل دخل ہے؟ اقبال کہنا یہی چاہتے ہیں کہ ایک معمولی ذرے سے لے کر اتنی وسیع کائنات میں، جس کا اندازہ لگانا ایک غیر معمولی بات ہے، ہر چیز مصروفِ عمل ہے۔ایک عنصر جو دو ذروں سے مل کر بنا ہے۔عنصر کے یہ دونوں ذرے متحرک ہیں۔یہ عنصر بھی متحرک ہے۔ذروں سے عنصر اور عناصر سے کائنات وجود میں آئی ہے۔اس طرح یہ وسیع کائنات بھی متحرک ہے۔اس لئے اس متحرک کائنات میں ہمیں بھی متحرک رہنا ہے۔یہی ہمارا طرزِ عمل ہونا چاہیے۔

اقبال اپنی ایک نظم ''چاند اور تارے'' کے ایک مصرعے میں اس کائنات کی ہر شئے کو بیقرار قرار دیتے ہیں ؎

بیتاب ہے اس جہاں کی ہر شے

جب ہم نے غیر جاندار ذرے کی حقیقت جاننے کی کوشش کی تو یہی پتہ چلا کہ یہ حرکت میں ہے۔ اسی طرح جب ہم ادنیٰ ترین جاندار مخلوق کے بارے میں جاننے کی کوشش کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ وہ بھی حرکت میں ہے۔

اگر ہم اس پر غور کریں کہ سبزیاں کیسے خراب ہوتی ہیں یا دودھ دہی میں کیسے تبدیل ہوتا ہے، اس بڑی تبدیلی کے پیچھے اللہ نے چھوٹی مخلوق رکھی ہیں، جو اس تبدیلی کو انجام دیتی ہیں اور

انہیں ہم سائنسی زبان میں جراثیم کہتے ہیں۔ ذروں کی طرح جراثیم کو بھی انسانی آنکھ نہیں دیکھ سکتی، بلکہ انہیں دیکھنے کیلئے طاقتور خوردبین کی ضرورت ہوتی ہے۔ جراثیم صرف ایک خلیے (Cell) والا جاندار ہے۔ اس خلیے میں مادہ حیات (Protoplasam) ہوتا ہے۔ جراثیم کا بیرونی طبقہ بڑا مضبوط ہوتا ہے جسے خلوی غشا (Cell membrane) یا خلوی دیوار (Cell Wall) کہتے ہیں۔ جراثیم مفید بھی ہوتے ہیں اور مضر بھی۔ مفید جراثیم انسان کیلئے معاون ثابت ہوتے ہیں اور مضر نقصان دہ۔ یہ چھوٹی مخلوق جن کو انسانی آنکھ نہیں دیکھ سکتی، ہر وقت مصروفِ عمل رہتے ہیں۔ گویا اس کائنات میں ہر شئے مصروفِ عمل ہے اور ہر شے کا مصروف عمل رہنا انسان کو یہ سوچنے پر آمادہ کرتا ہے کہ تمہارا متحرک رہنا بھی ضروری ہے اور اسی میں آپ کی بھلائی ہے ؎

جنبش سے ہے زندگی جہاں کی
یہ رسم قدیم ہے یہاں کی

اقبال نئی نسل سے ہم کلام ہیں۔ یہ ایک خاص فلسفیانہ شعر ہے، جو زندگی اور کائنات میں تغیر کے متعلق فلسفیانہ نظریہ پیش کرتا ہے۔ اقبال حرکت کو ایک قدیم تصور قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک جو زندگی متحرک ہے، وہی کامیاب بھی ہے۔ پانچویں صدی قبل مسیح کے ہرقلیطوس نے بھی یہی نظریہ پیش کیا تھا۔ جیسا کہ ممتاز حسین رقمطراز ہیں:

''سکون حرکت کے فلسفیانہ مسلے کے بارے میں اقبال۔۔۔ ہرقلیطوس کے ہمنوا ہیں۔ اور ان کے اشعار کہیں کہیں تو خود ہرقلیطوس کے اقوال معلوم ہوتے ہیں''۔[1]

ہرقلیطوس نے کہا تھا کہ کائنات کی بنیادی حقیقت تغیر ہے۔ دنیا کی ہر شئے عارضی ہے۔ کوئی بھی چیز پائدار نہیں۔ اس کا بنیادی تصور یہ تھا کہ ہم ایک ہی پانی میں دو بار پاؤں نہیں ڈال سکتے کیوں کہ دریا کا پانی ہر لمحہ نیا ہوتا ہے اور جس پانی سے ہمارے پاؤں پہلی بار دُھل جاتے ہیں

۱: تفسیر اقبال (مرتب: بہار الہ آبادی)، ص ۱۶۹۔

دوسری مرتبہ وہ پانی وہاں نہیں ہوگا۔ ہرقلیطوس کے نزدیک دنیا کی ہر شئے مسافر ہے۔ موجودات میں ہر چیز تغیر پذیر ہے۔ تبدیلی ہی ایک ایسی چیز ہے جس کو پائدار کہہ سکتے ہیں۔

''ہراقلیتس (Haraclitus) کا فلسفہ، فلسفۂ تغیر کے نام سے مشہور ہے کیوں کہ اس کی نظر میں تغیر وتلون ہی کائنات کی اصل حقیقت ہے۔ کائنات کی ہر شئے تغیر پذیر ہے۔ اس کا پہلا قول ہے کہ ایک ہی دریا میں کوئی دو بار قدم نہیں رکھ سکتا۔۔۔ اس کا یہ اصول ہے کہ جدوجہد یا تخالف ہی حیات کی بقا کی بنیاد ہے''۔[1]

ہرقلیطوس کا نظریہ یہی ہے کہ تغیر ایک پائدار شئے ہے۔ اقبال کا بھی یہی نظریہ ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ہرقلیطوس آگ کو پائدار سمجھتا تھا اور اقبال کے نزدیک اللہ پائدار ہے۔ اللہ کے بغیر ہر شئے کو فنا ہونا ہے۔ حضور ﷺ آخری پیغمبر اور نبی ہیں، قرآن آخری کتاب اور اسلام آخری مذہب ہے اور اس مذہب میں تغیر کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ علامہ اقبال اپنے خطبات میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

''تغیر وہ حقیقت ہے جسے قرآن پاک نے اللہ تعالیٰ کی ایک بہت بڑی آیت ٹھہرایا ہے۔''[2]

علامہ اقبال جدتِ طبع کے مالک تھے یہی وجہ ہے کہ جہاں وہ اپنے دور میں ایک کامیاب اور جدید شاعر، مفکر اور دانشور کے طور پر تسلیم کیے گئے، وہیں وہ اکیسویں صدی میں بھی نئی نسل کی ترجمانی کر رہے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ نئے دور کے نئے تقاضوں پر پورا اُترنا کسی بھی مفکر اور شاعر یا فلسفی کیلئے جوئے شیر لانے کے برابر ہے۔ اکیسویں صدی کے اس خلائی دور نے جہاں تمام فلسفی شاعروں کو مسترد کیا، وہیں اقبال اس دور میں بھی ایک معتبر شاعر تسلیم کیے جاتے ہیں۔

۱: جامع اردو انسائیکلوپیڈیا، جلد ۸، فنون لطیفہ، ص ۴۵۹۔

۲۔ مترجم: سید نذیر نیازی، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، (علامہ اقبال)، ص ۲۲۸۔

ڈاکٹر انور سدید نے اقبال اور اکیسویں صدی کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار یوں کیا ہے:

''انہوں نے (اقبال) شاعری میں حیات و کائنات کے نئے نظریات پیش کئے ۔۔۔اقبال کے تصورات کسی ایک زمانے کے ساتھ منسوب نہیں کئے جا سکتے اور نہ انہیں کسی مخصوص دائرے میں محدود کیا جا سکتا ہے۔۔۔ان کی نئی نئی توضیحات سامنے آتی رہیں۔۔۔اقبال جمود کو توڑ کر تحرک و حرارت پیدا کرنا چاہتے ہیں۔وہ حضرت انسان کو تسخیر فطرت کیلئے علم و فن میں کمال حاصل کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔۔۔اپنے خطبات میں واضح کیا کہ مذہب اور سائنس میں کسی قسم کا تضاد نہیں ہے۔اُنہوں نے کائنات کو ناتمام قرار دیا اور ''صدائے کن فیکون'' سننے کی تلقین، جو ہنوز ''دمادم'' آرہی ہے۔یہ سب ایسے موضوعات ہیں جو ہر زمانے میں زندہ رہتے ہیں اور جن پر ہر صدی میں نئے زاویوں سے غور کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔۔۔اور میں یہ یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ جس طرح اقبال نے بیسویں صدی میں انسان کی رہنمائی کی ہے، اسی طرح اکیسویں صدی بھی اپنا سفر علم اقبال کو تھام کر ہی کرے گی''۔[1]

اکیسویں صدی میں نت نئے مسائل ہمارے سامنے آرہے ہیں، جو ان مسائل کے ساتھ زمانے کے مطابق نمٹے گا وہی کامیاب رہے گا۔اقبال نے ہمیں قرآن فہمی کا سبق دیا تا کہ انسان اپنی دنیا اور آخرت سنوارے۔دنیا میں رہتے وقت ایک انسان کو چاہیے کو وہ رہبانیت، تصوف، لادینیت، عیاشی، برائی وغیرہ میں نہ کھو جائے، بلکہ قرآن سے رہنمائی حاصل کرتے ہوئے زندگی کے جدید تقاضوں کے ساتھ جینے کی کوشش میں جُٹ جائے اور زمانے میں ایک

۱: اقبالیات، (اُردو)، جولائی۔ستمبر، ۱۹۹۴ء، (اشاعت خاص)، جلد ۳۵، شمارہ ۲، ص ۲۳ تا ۲۵۔

فعال کردار ادا کرے۔

اکیسویں صدی میں انسان کو ایک فعال کردار ادا کرنا ہے، تبھی اسے موجودہ صدی کا انسان تصور کیا جائے گا۔ موجودہ صدی میں اقبال کا مقام وہی ہے، جو مقام اُنہیں بیسویں صدی میں حاصل تھا، بلکہ تعلیم کی وسعت اور نئی تیکنالوجی کی ترقی نے اقبال کا مقام اور بلند کیا اور ایسا لگتا ہے کہ اقبال نے اپنی شاعری اور خطبات اس صدی کو دیکھ کر ہی تصنیف کئے ہیں۔ دراصل اقبال وسیع نظر رکھتے تھے۔ اسی لئے وہ کہتے ہیں ؎

مری صراحی سے قطرہ قطرہ نئے حوادث ٹپک رہے ہیں
میں اپنی تسبیح روز و شب کا شمار کرتا ہوں دانہ دانہ

اقبال کی صراحی سے نئے حوادث کا ٹپکنا اس بات کی دلیل ہے کہ اقبال اس وسیع کائنات میں تنگ نظری کے قائل نہیں تھے، بلکہ وہ مستقبل میں نئے انداز سے جینے کے قائل تھے۔ اقبال کے فکر و فن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی توجہ آج سے زیادہ آنے والے کل پر تھی۔ ان کی شاعری میں خوش آئند مستقبل کی آرزومندی کا ذکر بار بار آتا ہے۔ وہ بزرگوں یا ہم عمروں سے اتنے مخاطب نہیں جتنے نوجوانوں یا نئی نسل سے ہیں۔ اس طرح وہ آج سے زیادہ کل کے شاعر نظر آتے ہیں۔

حقیقی معنوں میں جب اقبال کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو ایسا لگتا ہے کہ واقعی اقبال مستقبل کے شاعر ہیں۔ اکیسویں صدی کی اس پہلی دہائی میں ایسا لگتا ہے کہ شاید اقبال نے اکیسویں صدی کو دیکھ کر ہی اپنی تخلیقات تخلیق کی ہیں۔ اکیسویں صدی کے بارے میں ڈاکٹر نیاز سلطان رقمطراز ہیں:

''اُنیسویں صدی کا سب سے بڑا سائنسی عطیہ بھاپ کی طاقت تھی، بیسویں صدی ایٹمی توانائی کی صدی کہلائی اور ایٹم بم کی تخریبی طاقت سے حیاتِ انسانی کو خطرہ

لاحق ہوگیا ہے۔ ہیروشیما اور ناگاساکی کی دلدوز تباہی سے ذہن انسانی بُری طرح جھنجھوڑ اُٹھا۔ موجودہ صدی فضا اور آسمانوں کو تسخیر کرنے کی صدی ہوگی''۔[1]

ڈاکٹر نیاز سلطان اکیسویں صدی کو فضا اور آسمانوں یا دوسرے الفاظ میں خلاؤں کو تسخیر کرنے کی صدی کہتے ہیں۔ فضا اور آسمانوں کی تسخیر کے بارے میں اگر اقبال کی شاعری کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اقبال تقریباً آج سے ایک سو سال پہلے ہی فضا اور آسمانوں کی تسخیر یا دیگر الفاظ میں تسخیرِ کائنات کا فلسفہ پیش کر چکے ہیں۔ اقبال کی شاعری میں شاہین، معراج، کائنات، جبریل، افلاک وغیرہ کا فلسفہ دراصل کائنات کی تسخیر اور تسخیر کائنات کے ذرائع ہیں۔ اقبال نے ''جاوید نامہ'' کے نو میں سے سات مستقل ابواب میں نظام شمسی کے مختلف سیاروں جیسے فلک قمر، فلک عطارد، فلک زہرہ، فلک مشتری، فلک زحل وغیرہ کی سیر حاصل سیر کروائی ہے۔ مقصد صرف اتنا ہے کہ آنے والی نسل کائنات کی تسخیر کیلئے کمر بستہ ہو جائے۔

اقبال نے تسخیرِ کائنات کیلئے نئی نسل کو تیار رہنے کا سبق دیا ہے۔ وہ یہ سبق دیتے ہیں کہ اپنے آپ میں قرآن فہمی کا ذوق پیدا کرو۔ قرآن میں واضح ہے کہ کائنات کی معلومات حاصل کرو۔ اقبال نے قرآن کا گہرائی کے ساتھ مطالعہ کیا تھا، اس لئے وہ کہتے ہیں۔

اب کیا جو فغاں میری پہنچی ہے ستاروں تک
تو نے ہی سکھائی ہے مجھ کو یہ غزل خوانی

یہاں پر اقبال نے واشگاف الفاظ میں کہا ہے کہ یہ جو میری غزل خوانی ہے یا فلسفۂ کائنات، کائنات کے پوشیدہ راز کھول دینا، یہ دراصل تو نے (یعنی اللہ نے ہی) مجھے قرآن کے ذریعے بتائے ہیں، یہی وجہ ہے اگر میرے عشق کا چرچا حدود کائنات توڑ کر لامکان تک پہنچ گیا ہے اور کائنات کے پوشیدہ راز میں نے کھول دئے ہیں، تو یہ میرا قصور نہیں بلکہ قرآن میں تو

ا: اُمنگ، روزنامہ راشٹریہ سہارا، ۶ نومبر ۲۰۰۵ء، ص ا

ہدایت کی ہے ۔

کھول آنکھ زمین دیکھ فلک دیکھ فضا دیکھ
مشرق سے اُبھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ

اقبال تحقیق کائنات کے دروازے کھول رہے ہیں۔ وہ اپنے قاری کو سمجھا رہے ہیں کہ یہ زمین، سیارے، ستارے، فضا، آسمان وغیرہ، ان سب میں ہمیں دلچسپی پیدا کرنی چاہیے تا کہ ہم خدا کی وسیع کائنات کا مطالعہ کریں۔

ڈاکٹر سید افتخار حسین شاہ رقمطراز ہیں:

''مجھے کامل یقین ہے کہ علامہ اقبال اگر اس دور میں زندہ ہوتے، تو مشرق اور مغرب، مسلم اور غیر مسلم کے امتیازات سے بالکل آزاد ہو کر ان سائنسدانوں کو ضرور خراجِ عقیدت پیش کرتے، جنہوں نے چاند اور مریخ تک انسان کی رسائی کو ممکن بنا دیا ہے''۔[1]

ڈاکٹر سید افتخار حسین شاہ کے مذکورہ بالا اقتباس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اقبال کس قدر علومِ کائنات یا فلکیات میں دلچسپی رکھتے تھے۔ اُن کی شاعری کا ایک بڑا حصہ فلکیات سے تعلق رکھتا ہے۔ فلکیات میں اس قدر دلچسپی اس بات کی دلیل ہے کہ اقبال جدت طبع کے مالک تھے۔ اقبال اس بات کی تصدیق خود کرتے ہیں کہ مجھے کائنات میں دلچسپی قرآن نے سکھائی، ورنہ میری صدا یا میری نظر ستاروں تک کیسے پہنچتی۔ اقبال مسلمانوں کو قرآن فہمی کی دعوت دیتے ہیں۔ انہوں نے صاف الفاظ میں ضربِ کلیم کی ایک نظم ''اشتراکیت'' میں کہا ہے کہ جو شخص قرآن کا گہرائی کے ساتھ مطالعہ کرے گا وہی عصرِ حاضر کے تقاضوں سے ہمکنار ہو جائے گا۔

قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلمان
اللہ کرے تجھ کو عطا جدتِ کردار

ا: علامہ اقبال کا پیامِ تسخیر فطرت، اقبال اور پیروی شبلی، ص ۱۳۷۔

قرآن اللہ کی بھیجی ہوئی آخری کتاب ہے، یہ مکمل ہدایت کی کتاب ہے، اس پر چل کر انسان اپنی دنیا اور آخرت سنوار سکتا ہے۔ قرآن میں نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج وغیرہ سے تعلق جو آیتیں موجود ہیں وہ آسان زبان میں بیان کی گئی ہیں تا کہ عام انسان اُنہیں سمجھ سکے۔ اس کے بجائے قرآن میں جہاں بھی کائنات اور اس کے علوم کا ذکر آیا ہے، وہ اشارتاً آیا ہے جو عام انسانوں کیلئے نہیں ہے، بلکہ عقلمند اور غور وفکر کرنے والوں کیلئے ہے، تا کہ وہ اللہ کی صفات اور نعمتوں سے آگاہ ہوسکیں۔ ڈاکٹر فضل ن۔م۔ احمد رقمطراز ہیں:

''قرآن نماز، روزہ، زکوٰۃ وغیرہ کا ذکر ڈیڑھ سو آیات میں کرتا ہے مگر جابجا علم حاصل کرنے کیلئے سات سو چھپن آیات استعمال کرتا ہے، جس میں بیشتر آیات علم الفلک کیلئے ہیں۔ قرآن، کائنات اور علم الفلک کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ قرآن اللہ کی وحدانیت اُجاگر کرتا ہے تو کائنات کا عام مشاہدہ اس کے خالق کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ علم الفلک کے دقیق مسائل کو سمجھا کر اللہ کی ذات وصفات اور اس کے وجود کا یقین دلاتا ہے''۔[1]

اس حقیقت سے کسی کو بھی انکار نہیں ہوسکتا کہ اسلام نے حصولِ علم پر جتنا زور دیا ہے، اُتنا شاید ہی کسی دوسرے مذہب نے دیا ہو۔ اسلام نے اس بات پر زور دیا ہے کہ مہد سے لحد تک علم حاصل کرتے رہو۔ جب ہم قرآن کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ بات عیاں ہوجاتی ہے کہ اگر چہ قرآن، سائنس، فلکیات یا جغرافیہ کی کتاب نہیں، لیکن پھر بھی اس میں ان موضوعات سے بحث ضرور کی گئی ہے۔ قرآن نے اس بات پر کافی زور دیا ہے کہ تمام انسان کائنات ارضی اور مظاہر قدرت پر غور وفکر سے کام لیں کیوں کہ یہی علم کی معراج ہے اور قوتِ فکر وعمل سے ہی کائنات کی

۱: ماہنامہ سائنس (اُردو)، نئی دہلی، مئی ۲۰۰۶ء، جلد ۱۳، شمارہ ۵، ایڈیٹر محمد اسلم پرویز، ص ص ۱۰ تا ۱۲۔

اشیاء کا علم حاصل ہوتا ہے۔ قرآن حکیم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

أَوَلَمْ يَنظُرُوا فِي مَلَكُوتِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللَّهُ مِن شَيْءٍ [1]

ترجمہ: کیا یہ لوگ کائنات ارض وسماء اور دیگر تحقیقات الٰہیہ پر غور نہیں کرتے۔ [2]

قرآن میں ہی ایک اور جگہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

قُلِ انظُرُوا مَاذَا فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ [3]

ترجمہ: ان سے کہو کہ ارض وسماء میں جو کچھ ہے اسے آنکھیں کھول کر دیکھیں۔ [4]

یعنی ان آیات مبارکہ میں انسانوں کو اس بات کی طرف متوجہ کیا گیا ہے کہ آسمان اور زمین کے درمیان جو کچھ بھی ہے اس پر غور وفکر، تدبر و تحقیق اور تجربات کرتے رہو، حقیقت یہ ہے کہ قرآن میں اس قدر سائنسی موضوعات بیان کئے گئے ہیں اور ان موضوعات میں زیادہ تر کائنات کے متعلق بیان کیا گیا ہے۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ قرآن کی سات سو پچاس آیتیں یعنی قرآن کے آٹھویں حصے میں انسان کو اس بات کی تلقین کی گئی ہے کہ وہ فطرت کا مطالعہ اور مشاہدہ کرے اور کائنات کی اشیاء پر غور وفکر اور تدبر سے کام لے۔ نیز سائنسی اور تجرباتی علوم حاصل کرے۔

اقبال کی قرآن فہمی نے انہیں غور وفکر پر مجبور کیا، یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی شاعری میں تسخیر کائنات کا باضابطہ فلسفہ یا نظریہ پیش کیا۔ قرآن فہمی کے علاوہ حضور ﷺ کے واقعۂ معراج سے اقبال نے یہ بات اخذ کی ہے کہ انسان قوائے فطرت اور عناصرِ کائنات کی تسخیر کر سکتا ہے

۱: قرآن حکیم، سورۃ اعراف، آیت نمبر ۱۸۵۔

۲: مولانا مودودی، تفہیم القرآن، تلخیص (مولانا صدرالدین اصلاحی)، ص ۲۸۵۔

۳: قرآن حکیم، سورۃ یونس، آیت نمبر ۱۰۱۔

۴: مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، تفہیم القرآن، تلخیص (مولانا صدرالدین اصلاحی)، ص ۳۵۵۔

اس طرح انسان زمان ومکان پر غالب آسکتا ہے۔ بال جبریل کی ایک غزل میں فرماتے ہیں۔

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفیٰؐ سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

واقعہ یوں ہے کہ ہجرت سے ایک سال قبل، حضور ﷺ کو حضرت جبریلؑ براق پر بٹھا کر مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گئے۔ جہاں پر آپؐ نے انبیاؑ کے ساتھ نماز ادا کی، پھر آپؐ کائنات کی طرف روانہ ہوئے۔ وہاں مختلف طبقاتِ سماوی میں آپؐ نے مختلف انبیاؑ سے ملاقات کی، آپؐ نے جنت اور جہنم کو دیکھا، آخر کار آپؐ انتہائی بلندیوں پر پہنچ کر اپنے رب کے حضور حاضر ہوئے، اس وقت آپؐ کو اللہ تعالیٰ نے اہم ہدایات اور حکم دئے، اس کے بعد آپؐ بیت المقدس کی طرف واپس لوٹے اور وہاں سے مسجدِ حرام واپس تشریف لائے اور یہ سارا واقعہ ایک رات میں انجام پذیر ہوا۔

قرآن حکیم میں اس واقعے کا مختصر ذکر اللہ تعالیٰ نے اس طرح کیا ہے:

سُبْحَانَ الَّذِي أَسْرَىٰ بِعَبْدِهِ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ
إِلَى الْمَسْجِدِ الْأَقْصَى الَّذِي بَارَكْنَا حَوْلَهُ لِنُرِيَهُ مِنْ آيَاتِنَا [1]

ترجمہ: پاک ہے وہ جو لے گیا، ایک رات اپنے بندے کو مسجدِ حرام سے دور اُس مسجد تک، جس کے ماحول کو اس نے برکت دی ہے، تاکہ اسے اپنی کچھ نشانیوں کا مشاہدہ کرائے۔"[2]

قرآن حکیم میں شبِ معراج کی فقط اتنی ہی حقیقت بیان ہوئی ہے۔ اس سلسلے کی بقیہ معلومات ہمیں حدیث مبارکہ سے ملتی ہیں۔ حدیث کی یہ باقی تفصیلات قرآن کے خلاف نہیں بلکہ

۱: قرآن حکیم، سورۃ ۱۷، آیت نمبر ۱

۲۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، تفہیم القرآن، تلخیص، (مولانا صدرالدین اصلاحی)، ص ۴۵۰۔

یہ قرآن کی اس حقیقت کے بعد کا بیان ہے، جو حقیقت معراج کی رات کے دوران پیش آئی۔

معراج کی رات کے سفر کی حالت کچھ یوں ہے۔ قرآن کے سورۂ بنی اسرائیل (۱۷) کی پہلی آیت کی ابتداء اس طرح سے ہوتی ہے۔ ''پاک ہے وہ ذات، جو لے گیا'' یہ الفاظ ثابت کرتے ہیں کہ یہ واقعہ حقیقی واقعہ ہے۔ یعنی حضورؐ بذاتِ خود (بہ جسد پاک) معراج کیلئے تشریف لے گئے تھے، نہ کہ یہ واقعہ عالمِ خواب یا کہ بیداری میں اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے روحانی طور پر پیش آیا اور اس حقیقت کو انجام دینے کیلئے خدائے بزرگ نے جبریلؑ، جس کے ساتھ ایک قسم کی تیز ترین سواری جس کا نام ''براق'' ہے، بھیجی تھی۔ حضرت جبریلؑ کا سواری کے ساتھ حضور ﷺ کو لے جانا اور جس کو قرآن نے 'لے گیا' کے الفاظ میں برتا ہے، صریحاً دلالت کرتا ہے کہ یہ سفر جسمانی طور پر ہوا تھا، نہ کہ خواب میں یا روحانی طور پر۔ اس لئے اس بات کو ایک دانشورانہ اور مفکرانہ سوچ یہ ماننے کیلئے قطعاً تیار نہیں کہ یہ روحانی سفر تھا، بلکہ معراج کا واقعہ ایک جسمانی سفر اور عینی مشاہدہ تھا، جو اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو کروایا۔

علامہ اقبال معراج کے واقعہ سے کافی متاثر ہوئے تھے، اسی لئے اُنہوں نے اس واقعہ سے سبق لینے کی تلقین کی ہے، تاکہ نئی نسل اس واقعے کو سرسری نہ لے بلکہ معراج کے واقعے پر غور و فکر کرے اور خود تیار ہو جائے۔ کائنات پر کمند ڈالنے کیلئے اور اس میں یہ شعور پیدا ہو جائے کہ یہ کائنات، جو میری نظروں سے کافی دور ہے، میں بھی اگر تحقیق کرنا شروع کروں تو ان دوریوں کو ختم کر سکتا ہوں۔ ''جاوید نامہ'' کے ایک شعر میں فرماتے ہیں ؎

از شعور است ایں کہ گوئی نزد و دور

چیست معراج؟ انقلاب اندر شعور

مذکورہ بالا شعر میں اقبال نے سوال یہ اٹھایا ہے کہ معراج کیا ہے؟ یا معراج کی حقیقت کیا

ہے؟اس کا جواب پروفیسر سلیم یوسف چشتی نے اس طرح دیا ہے:

''معراج کیا ہے؟ اس شعور میں جو زمان و مکان کی قید میں ہے، انقلاب ہی کا دوسرا نام ہے۔ حضور اقدس ﷺ نے اپنے شعور کو زمان و مکان کی قید سے آزاد کرلیا تھا، اس لئے آپ ﷺ آن واحد میں ساتوں آسمانوں کی سیر کر کے اپنے حجرہ میں واپس تشریف لے آئے''۔[1]

اقبال نے اپنے مذکورہ بالا شعر کے پہلے مصرعے میں یہ بات کہی تھی کہ جس کا شعور نزدیک اور دور کے فاصلوں سے آزاد ہو گیا، یعنی جس نے یہ طے کرلیا کہ نزدیکیاں یا دوریاں اس کے کام میں حائل نہیں ہوسکتیں، اُس کے اندر انقلاب آجاتا ہے اور اُس کا کام انجام کو پہنچ جاتا ہے۔ اقبال کے نزدیک معراج کا فلسفہ بھی یہی ہے یعنی بقول پروفیسر یوسف سلیم چشتی ''اپنے شعور کو زمان و مکان کی قید سے آزاد کرنا'' اور حضور ﷺ نے اپنے آپ کو اس قید سے آزاد کر دیا تھا۔ بلکہ آپؐ ہر کام میں پُر امید ہوتے تھے اور آپ ﷺ کے کام میں دوریاں اور نزدیکیاں حائل نہیں ہوسکتی تھیں۔ معراج کے وقت بھی آپ ﷺ نے یہ نہیں سوچا کہ رات کا وقت ہے اور سفر دور کا ہے اس وقت نہیں کل جائیں گے، بلکہ آپ ﷺ فوراً سفر کیلئے روانہ ہوئے۔

اقبال کے کہنے کا مقصد بھی یہی ہے کہ آپ بھی کائنات کا سفر طے کر سکتے ہیں، شرط یہ ہے کہ آپ اپنے شعور میں انقلاب پیدا کریں اور زمان و مکان کی قید سے آزاد ہو جائیں۔ جب تم اس قید سے آزاد ہو جاؤ گے، تو پھر نزدیکیاں اور دوریاں آپ کیلئے برابر ہو جائیں گی اور جس جگہ کو آپ کا شعور دور سمجھتا ہے، وہ آپ کیلئے قریب ہو جائے گا۔ اس طرح آپ دوریوں پر قابو پاؤ گے۔

۱: بال جبریل مع شرح، ص ۲۵۳۔

اقبال قرآن فہمی اور فلسفۂ معراج کا نظریہ دراصل اسی لئے پیش کرتے ہیں، تاکہ نئی نسل کو اس متحرک کتاب اور اس متحرک واقعہ سے آگے بڑھنے کیلئے ایک تحریک ملے۔

اپنے ایک فارسی شعر میں کہتے ہیں ؎

عصرِ ما مارا زما بیگانہ کرد
از جمال مصطفیٰؐ بیگانہ کرد

اقبال موجودہ زمانے سے شکوہ کرتے ہیں کہ اس نے ہمیں اپنے آپ اور اصلی حسن سے بیگانہ کر دیا اور وہ کیا حسن ہے، جس سے بیگانہ کیا؟ اس حسن کو اقبال نے جمالِ مصطفیٰؐ سے تعبیر کیا ہے۔ دراصل اقبال کہنا یہی چاہتے ہیں کہ ہم اسلام کے اصل نظریہ سے بے خبر ہیں اور اس بے خبری کی وجہ ''بال جبریل'' کے اس شعر میں بتاتے ہیں ؎

شیر مردوں سے ہوا بیشہ تحقیق تہی
رہ گئے ہم صوفی و ملا کے غلام اے ساقی

اقبال نے مذکورہ بالا شعر میں اسلام کے اصل فلسفہ کا راز بیان کیا ہے۔ اسلام تحقیق، جستجو، مصروفِ عمل رہنے کو ترجیح دیتا ہے نہ کہ خانقاہ نشین ہو جانے کو یا تصوف کی وجہ سے رہبانیت اختیار کرنے کو یا پھر ملا کے جال میں پھنس جانے کو۔ ان تمام چیزوں نے اسلام کو کافی نقصان پہنچایا ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ ہم اب صوفی و ملاّ کے غلام بن چکے ہیں اور ہمارے اندر تحقیق کا مادہ ختم ہو چکا ہے، جس کی وجہ سے ہم نے کئی کارنامے انجام دئے تھے۔ ہسپانیہ کے مسلمانوں کے کارنامے دیکھ کر اقبال کو مسلمانوں کا وہ روشن دور یاد آتا ہے جب مسلمانوں نے تحقیق کی بدولت کئی کارنامے انجام دئے تھے۔ اب اقبال ایک بار پھر مسلمانوں کو اس طرف لے جانا چاہتے ہیں، تاکہ مسلمان از سرِ نو اپنی تعمیر شروع کریں۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کائنات کو

تسخیر کرنے کا فلسفہ پیش کرتے ہیں اور وجہ یہ بتاتے ہیں کہ یہ کام ہمارے نبی ﷺ نے انجام دیا ہے۔

اقبال کہتے ہیں۔

فقر مومن چیست؟ تسخیر جہات

بندہ از تاثیرِ او مولا صفات

اقبال اس شعر کے پہلے مصرعے میں سوال بھی کرتے ہیں اور جواب بھی دیتے ہیں۔ سوال یہ کہ مومن کا فقر کیا ہے؟ جواب دو الفاظ میں ہے۔ تسخیر جہات یعنی تمام اطراف کو گرفت میں لانا۔ یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے؟ اس کے لئے طریقہ یہ ہے کہ اگر انسان اپنے اندر تحقیق و جستجو کا نظام پیدا کرے، تو اس میں اللہ کی صفات منعکس ہوجاتی ہیں۔ جب یہ حالت انسان کے اندر شروع ہوجاتی ہے، تو وہ زمان و مکان کے بندھنوں سے آزاد ہوجاتا ہے اور یہی آزادی اسے کائنات کی تسخیر کراتی ہے۔ ''ضربِ کلیم'' کی ایک نظم ''معراج'' میں اقبال نے جہاں معراج کی حقیقت کو سمجھاتے ہوئے کہا ہے کہ اے مسلمان اگر تیرے اندر عشقِ رسول ﷺ پیدا ہوجائے تو یہ عشق تیرے اندر وہ انقلاب پیدا کرے گا کہ تو کائنات کو مسخر کرسکتا ہے۔ اسی نظم کے آخری اشعار میں کہتے ہیں ؎

ناوک ہے مسلمان! ہدف اس کا ثریا

ہے سرِّ سرا پردہ جان نکتہ معراج

تو معنی والنجم نہ سمجھا تو عجب کیا

ہے تیرا مدوجزر ابھی چاند کا محتاج

اقبال مسلمان کو تسخیرِ کائنات کیلئے فلسفۂ معراج کو سمجھنے اور اس پر غور و فکر کرنے کی تلقین

کرتے ہیں، تاکہ یہ سبق حاصل ہو سکے کہ معراج کا واقعہ دراصل تسخیر کائنات کا وہ نظریہ ہے، جس کو سامنے رکھ کر انسان اپنے آپ کو خلاؤں میں جانے کیلئے تیار کر سکتا ہے۔ معراج کا واقعہ اُن تمام نظریوں پر ایک کاری ضرب ہے، جو خلاؤں اور کائنات کے بارے میں لوگ رکھتے تھے، معراج کے واقعے کے بعد کائنات کے متعلق تمام پرانے خیالات بھک سے اُڑ گئے اور کائنات کو تسخیر کرنے کا نیا نظریہ سامنے آیا۔

اس سے پہلے کہ ہم اقبال اور تسخیر کائنات کا جدید نظریہ سمجھنے کی کوشش کریں۔ پہلے کائنات اور اس کے علوم کے بارے میں واقفیت حاصل کرنا ضروری ہے۔

اقبال کا نظریہ کائنات قرآن اور معراج النبی ﷺ کے اردگرد گھومتا ہے۔ قرآن میں بیان ہوا ہے کہ کائنات پر غور و فکر کرو۔ قرآن حکیم میں انسان کو زمین و آسمان کی پیدائش یعنی کائنات کی تخلیق کے بارے میں غور و فکر اور تدبر کی ہدایت کی گئی ہے، تاکہ انسان کائنات کی تخلیق کو دیکھ کر خالقِ کائنات کو پہچانے۔ کائنات نے انسان کو ہمیشہ غور و فکر کرنے کی دعوت دی ہے۔

کائنات کی تخلیق کے بارے میں مختلف نظریات موجود ہیں۔ قرآن حکیم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

ثُمَّ ٱسْتَوَىٰٓ إِلَى ٱلسَّمَآءِ وَهِىَ دُخَانٌ [1]

ترجمہ: پھر آسمان (کے بنانے) کی طرف توجہ فرمائی اور وہ (اس وقت) دھواں سا تھا۔[2]

کائنات کی تخلیق کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ یہ پہلے دھواں تھا اور اسی دھواں کی طرف اللہ تعالیٰ نے توجہ فرمائی، اسے حکم دیا اور یہ دھواں کائنات میں تبدیل ہو گیا۔ پروفیسر ڈاکٹر فضل کریم اس دھویں اور قرآن کی اس آیت کے بارے میں فرماتے ہیں:

۱۔ قرآنِ حکیم، سورہ ۴۱، آیت ۱۱۔

۲۔ مترجم: مولانا اشرف علی تھانویؒ، قرآن مجید، ص ۵۷۴۔

''یہ دھواں درحقیقت کائنات کے تخلیقی مادے پر مشتمل تھا۔ تخلیقی مادہ تمام عناصر کے بخارات پر مشتمل تھا۔ چونکہ درجہ حرارت اتنا شدید تھا کہ ہر عنصر بخارات کی صورت میں موجود تھا، جسے قرآن کی آیت مذکورہ میں ''دخان'' کہا گیا ہے۔ اس حقیقت پر آج تمام سائنس دان متفق ہیں''۔[1]

جس حقیقت پر آج کے جدید ماہرِ فلکیات متفق ہیں اس کی جانکاری قرآن نے آج سے چودہ سو سال پہلے ہمیں فراہم کی ہے۔ اسی نظریے پر جدید فلکیات کے نظریئے قائم ہیں۔ کائنات کے بارے میں مختلف ماہرِ فلکیات نے اپنے نظریئے پیش کئے ہیں جن میں بگ بینگ تھیوری (Big Bang Theory) اور آئن اسٹائن کی اضافیت کے نظریے کو کافی اہمیت حاصل ہے۔

بگ بینگ تھیوری کے مطابق عظیم جوہر (Superatom) کے پھٹ پڑنے کے بعد اس کا سارا مادہ بکھرنے لگا اور ایک وسیع وعریض کائنات وجود میں آگئی۔

آئن اسٹائن کی اضافیت کی تھیوری کے مطابق کائنات کے وسیع سے وسیع تر ہونے کی رفتار اتنی تیز ہے کہ اس کے فاصلے ہر ایک سو تیس کروڑ سال بعد دوگنے ہو جاتے ہیں۔

جدید دوربینوں، جو کھربوں میل تک دور کی چیزوں کو صاف دکھا رہی ہیں، کی مدد سے جب خلاؤں میں جھانکا گیا تو بھی آسمان کو وہ جوں کا توں پیش کر رہی تھیں۔ اگر کائنات میں ہم صرف کہکشاں کی بات کریں جس میں ہمارا نظام شمسی واقع ہے کیونکہ اس کے ایک سرا سے دوسرے سرے تک کا فاصلہ ایک لاکھ نوری سال کا ہے اور اس میں ایک اندازے کے مطابق کوئی تین لاکھ ملین سیارے محوِ گردش ہیں۔ اگر اس کہکشاں سے نظام شمسی کے فاصلے کو ناپا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہمارا نظام شمسی اس کے مرکز سے ستائیس ہزار نوری سال کی طویل دوری پر واقع ہے۔

سوپرنووا (Supernova) کے مشاہدات اور اسٹرنگ تھیوری سے ثابت ہوتا ہے کہ ہماری

۱۔ کائنات اور اس کا انجام: قرآن اور سائنس کی روشنی میں، ص ۶۱۔

کائنات کی عمر تقریباً (۱۳،۷) ارب سال ہے۔ کائنات میں عام مادہ صرف چار فیصد ہے اس میں روشن مادہ جن میں ستارے گیلکسی اور اسی قسم کے دوسرے مادے صرف (۰،۴) فیصد ہیں۔

قدرت کی یہ عظیم الشان کائنات جس میں بے شمار کہکشائیں واقع ہیں ان کہکشاؤں میں موجود لاتعداد سیارے ہیں اور اسی کائنات میں واقع ایک کہکشاں کے ایک کونے میں ہمارا نظام شمسی (Solar System) ہے۔ اس بڑے نظامِ شمسی میں ہماری خوبصورت زمین باقی سیاروں کی طرح برابر نظم و نسق کے ساتھ اپنے کام میں مصروف عمل ہے۔ کائنات کو انگریزی میں یونیورس (Universe) کہتے ہیں، جس کے معنی ہیں ہر وہ چیز جو خدا نے تخلیق کی ہے۔ اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں ہر وہ شئے جو خدا نے تخلیق کی ہے کائنات کہلاتی ہے۔

کائنات کی اس بناوٹ کو دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے اور اہل عقل ہمیشہ اس سوال میں محو رہتے ہیں کہ یہ کائنات کتنی بڑی ہوگی، وغیرہ وغیرہ۔ علامہ اقبال ''رموزِ بے خودی'' میں یوں کہتے ہیں ؎

در جہاں کیف و کم گردید عقل
پے بہ منزل بُرد از توحید عقل

جب انسان میں مطالعہ اور غور و فکر یا حقیقت شناسی کا احساس پیدا ہو جاتا ہے تو سب سے پہلا اور بڑا سوال اس کے ذہن میں یہ آتا ہے کہ یہ کائنات کیا ہے؟ اس کو تخلیق کرنے والا کون ہے؟ گویا کہ اہل دانش کیلئے کائنات کا فلسفہ توحید کا فلسفہ ہے۔ جس نے کائنات کی حقیقت سمجھ لی اسے یہ سمجھ آئے گا کہ اس کا بنانے والا ایک ہے اور وہی خدا ہے۔ اقبال کو کائنات کے فلسفے میں توحید کا فلسفہ نظر آتا ہے۔ رموزِ بیخودی میں کہتے ہیں ؎

بیم و شک میرد عمل گیرد حیات
چشم می بیند ضمیرِ کائنات

اقبال کائنات اور اس کی تخلیق کے بارے میں یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ خدا نے اس لئے کائنات بنائی تا کہ لوگ توحید کی طرف مائل ہو جائیں۔ جب ایک انسان کو توحید کا اصل علم حاصل ہو جاتا ہے تو آہستہ آہستہ مطالعہ اور تفکر و تدبر کے بعد اس پر کائنات کی حقیقت منکشف ہو جاتی ہے یعنی کائنات کا بنانے والا ایک ہے جس نے اپنی حقیقت کو سمجھانے کیلئے کائنات کی حقیقت پر غور و فکر کرنے کا موقعہ فراہم کیا تا کہ لوگ کائنات کی بناوٹ پر غور و فکر کریں اور مجھ تک پہنچ جائیں۔ مولانا وحید الدین خان توحید اور کائنات کی حقیقت کے بارے میں رقمطراز ہیں:

"۔۔۔ یہ منکرینِ خدا کا بہت پرانا استدلال ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ کائنات کا اگر کوئی خالق مانیں تو اس خالق کو لازمی طور پر ازلی ماننا پڑے گا، پھر جب خدا کو ازلی ماننا ہے تو کیوں نہ کائنات کو ہی ازلی مان لیا جائے۔ اگر چہ یہ بالکل بے معنی بات ہے، کیونکہ کائنات کی کوئی ایسی صفت ہمارے علم میں نہیں آئی ہے جس کی بناء پر اس کو خود اپنا خالق فرض کیا جا سکے۔۔۔ تاہم انیسویں صدی تک منکرین کی اس دلیل میں ایک ظاہر فریب حسن ضرور موجود تھا، مگر اب حرکیات حرارت کے دوسرے قانون (Second Law of Thermodynamics) کے انکشاف کے بعد یہ دلیل بالکل بے بنیاد ثابت ہو چکی ہے"۔[1]

خالق اور تخلیق کے بارے میں اقبال کا خیال ہے کہ تخلیق خالق تک پہنچنے اور اسے جاننے کا ذریعہ ہے۔ مولانا وحید الدین کا مذکورہ بالا اقتباس اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ انیسویں صدی تک منکرین یہ دلیل دیتے تھے کہ کائنات ہی خدا ہے مگر سائنس کے حرکیات حرارت کے

۱۔ مذہب اور جدید چیلنج، ص ۵۵۔

دوسرے قانون نے اس پر کاری ضرب لگادی اور اب یہ ثابت ہو چکا ہے کہ خالق الگ ہے اور تخلیق الگ، گویا سائنس کے جدید نظریے توحید کا نظریہ پیش کرتے ہیں۔ اقبال نے اپنے اسی فلسفے کو مثنوی ''مسافر'' میں یوں پیش کیا ہے ؎

از ضمیر کائنات آگاہ اوست
تیغ لا موجود الااللہ اوست

بیسویں صدی میں فلکیاتی سائنس میں جو نئی تحقیق ہوئی ہے، اس نے کائنات کے بارے میں تمام پرانے نظریات کو مسترد کر دیا، بگ بینگ (Big Bang) کا نظریہ جو سائنسی حلقے میں اب ایک مسلمہ بن چکا ہے، وہ ثابت کرتا ہے کہ خالق اور مخلوق دونوں ایک نہیں ہو سکتے۔ خالق بے شک تخلیق سے مختلف اور الگ ہے، اسی لئے خالق تخلیق کر سکتا ہے۔ اگر خالق خود بھی تخلیق ہوتا تو تخلیق کا واقعہ کبھی وجود میں نہ آتا۔

بگ بینگ کا نظریہ بتاتا ہے کہ تیرہ بلین سال پہلے پوری کائنات ایک عظیم جوہر یا سپر ایٹم (Super Atom) کی صورت میں موجود تھی۔ اس سپر ایٹم کے اندر انفجار (Explosion) ہوا، وہ بھی خارجی مداخلت کے ذریعے۔ اس انفجار کے بعد سپر ایٹم کے ذرات خلا میں پھیل گئے اور موجودہ کائنات وجود میں آئی۔ سپر ایٹم کے اندر یہ انفجار خود بخود یا داخلی سبب سے نہیں ہوا بلکہ ایسا خارجی مداخلت کی وجہ سے ہوا۔ بگ بینگ کے اس نظریئے سے صاف ظاہر ہے کہ سپر ایٹم الگ تھا اور مداخلت کار الگ، اس لئے خالق الگ ہے اور تخلیق الگ۔ یہ اقبال کی اس بات کی وکالت کرتا ہے کہ کائنات خدا کی وحدانیت کی دلیل پیش کرتا ہے جس نے یہ کائنات تخلیق کی۔ اقبال ''تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ'' کے تیسرے خطبے میں رقمطراز ہیں:

''وہ لامتناہی ہے تو ان معنوں میں، کہ اس کی تخلیقی فعالیت کے ممکنات، جو اس کے اندرون وجود میں مضمر ہیں، لامحدود ہیں اور یہ کائنات جیسا کہ ہمیں اس کا علم ہوتا ہے ان کا جزوی مظہر''۔[1]

اقبال کا تصورِ خدا (Concept of God) یہ نہیں کہ اس کا اقرار صرف زبان سے کیا جائے کہ خدا ایک ہے اور بس، بلکہ اقبال خدا کی بنائی ہوئی اس کائنات کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں تا کہ انسان خدا کی وحدانیت کا دل سے قائل ہو جائے۔ اقبال کو مکمل یقین ہے کہ اگر ایک انسان کائنات کے متعلق ہر قسم کے ممکن سوالات کا تسلی بخش جواب پانے میں کامیاب ہو جائے تو اسی جواب میں اسے اپنے متعلق ہر قسم کے ممکن سوالات کا تسلی بخش جواب مل جائے گا اور پھر وہ اس جواب کی روشنی میں اپنے تمام مسائل کا صحیح حل معلوم کر سکے گا۔ اقبال کہتے ہیں ؎

ہستی حاضر کند تفسیر غیب
می شود دیباچہ تسخیر غیب

یہاں اقبال سمجھاتے ہیں کہ اس عظیم کائنات کی ہستی یا اس کائنات کا تصور، غیب یعنی خدا کے وجود کا ثبوت فراہم کرتے ہیں یا خدا کے وجود پر دلالت کرتے ہیں اور اگر اے انسان تو اس کائنات کو تسخیر کرنے میں کامیاب ہو جائے گا تو تجھ میں غیب کو جاننے کی صلاحیت پیدا ہو جائے گی۔ فقط زبان سے توحید کا دعویٰ کرنا لاحاصل ہے۔

زبان سے گر کیا توحید کا دعویٰ تو کیا حاصل
بنایا ہے بتِ پندار کو اپنا خدا تو نے

۱۔ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، (اقبال)، ص ۱۳۵۔

اقبال نے کائنات کی حقیقت کا جو تصور پیش کیا ہے اس کے مطابق حقیقت کائنات نہ کوئی تفریحی مشغلہ ہے اور نہ ہی کوئی عملی یا نظری مسئلہ، بلکہ یہ ایک شدید عملی ضرورت ہے، جس کی اچھی یا بری تشفی اس کی روزمرہ زندگی کے تمام حالات اور اس کی تمام چھوٹی بڑی تفصیلات کو معین کرتی ہے۔ جب انسان کائنات کی حقیقت سے باخبر ہو جاتا ہے تو وہ اپنی عملی زندگی کو نہایت احتیاط کے ساتھ اس کے مطابق بناتا ہے اور اس کے ذہن و دل میں خدا کی وحدانیت کا یقین پیدا ہو جاتا ہے یعنی انسان بقول اقبال تسخیر غیب کے دوران تفسیر غیب کا فلسفہ پاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال تسخیر کائنات کا فلسفہ پیش کرتے ہیں تا کہ انسان توحید کا فلسفہ جان لے۔ اس لئے کہتے ہیں ؎

اگر بہ سینہ ایں کائنات در نہ رو
نگاہ را بہ تماشا گزاشتن ستم است

یعنی اگر تو کائنات کے راز نہیں جان سکتا ہے یا اگر تو سینۂ کائنات میں نہیں اُتر سکتا ہے تو پھر آنکھوں کو محض دیکھنے کیلئے چھوڑ دینا ظلم و زیادتی ہے۔ اقبال کائنات کے بارے میں ذمہ داری کے ساتھ آگاہ کرتے ہیں کہ یہ محض دیکھنے کیلئے نہیں ہے بلکہ یہ تحقیق کا مطالبہ کرتی ہے۔ ''بانگ درا'' کی ایک نظم میں اس پرانے نظام سے نکلنے کا مشورہ دیتے ہوئے کائنات کے بارے میں کہتے ہیں ؎

تھا تخیل جو ہم سفر میرا
آسماں پر ہوا گزر میرا
اُڑتا جاتا تھا اور نہ تھا کوئی
جاننے والا چرخ پر میرا

تارے حیرت سے دیکھتے تھے مجھے
راز سربستہ تھا سفر میرا
حلقۂ صبح و شام سے نکلا
اس پرانے نظام سے نکلا

اقبال تخیل کی بنیاد پر ہمیں فلک کی سیر کرواتے ہیں اور اس خوبصورت انداز میں کہ پڑھنے والا بھی صبح وشام یعنی حدود و قیود سے آزاد ہو جانا چاہتا ہے اور اس پرانے نظام سے نکلنا چاہتا ہے اور نئے نظام یعنی تخیل کی دنیا سے نکل کر عملی دنیا میں آنا چاہتا ہے، جہاں پر وہ تخیل میں افلاک کی سیر کرنے کی بجائے جدید سائنس کی بنیاوں پر کائنات کی سیر کرنا چاہتا ہے ؎

محبت مجھے اُن جوانوں سے ہے
ستاروں پر جو ڈالتے ہیں کمند

یعنی پرانے نظام سے نکل کر نئے فلکیاتی طریقوں سے کمند ڈالتے ہیں۔ لفظ کمند کے لغوی معنی ہیں جال یا رسی کی سیڑھی جس کے ذریعے مکان پر چڑھا جاتا ہے۔ اس شعر میں اقبال نے اُن لوگوں کے تئیں محبت کے جذبہ کا اظہار کیا ہے اور اُن کا خیر مقدم کیا ہے اور باضابطہ طور اُن لوگوں کی حوصلہ افزائی کی ہے جو کائنات میں جانے کے راستے تیار کر رہے ہیں۔ جدید تیکنالوجی کے مطابق کائنات میں جانے کیلئے جہاں خلائی جہاز (Space-craft) تیار کئے گئے وہی خلابازوں نے باضابطہ طور خلاؤں میں جانے کیلئے خلائی اسٹیشن (Space-station) کے بارے میں بھی غور وفکر کیا۔

شاید چاند کو اس طرح اپنے مدار پر چکر لگاتا دیکھ کر انسان نے یہ سوچا ہوگا کہ وہ بھی چاند کی طرح کوئی ایسا مصنوعی سیارہ بنائے جو چاند کی طرح خلا میں چکر لگاتا رہے اور ہمیں زمین، سورج،

چاند، ستاروں اور دیگر اجسام فلکی کا مشاہدہ و معائنہ کر کے ضروری معلومات فراہم کرتا رہے، انسان اس سمت میں مسلسل کوشش کرتا رہا اور آخر کار ۱۹ اپریل ۱۹۷۱ء کا وہ دن بھی آ گیا جب وہ ایک سٹلائیٹ بنا کر اسے خلا میں بھیجنے کیلئے تیار ہو گیا۔ روس نے سلویٹ۔۱ (Salyut-1) نامی ایک مصنوعی سیارہ بنا کر خلا میں بھیجا، یہ دنیا کا سب سے پہلا خلائی اسٹیشن تھا اور یکے بعد دیگرے خلا میں خلائی اسٹیشن بنائے جانے لگے۔ آج کا خلاباز خلائی اسٹیشن میں رہنے بھی لگا ہے۔

خلائی اسٹیشن کا استعمال تجربہ گاہوں کے طور پر کیا جاتا ہے۔ ان تجربہ گاہوں میں جہاں ایک جانب سائنس و انجینئرنگ سے متعلق تجربے کیے جاتے ہیں، وہیں دوسری جانب ان میں خلائی جہازوں کی مرمت کرنے کا انتظام بھی ہے۔

خلائی اسٹیشنوں کو خلائی بندرگاہ (Space-ports) بنائے جانے پر سوچا جا رہا ہے۔ اس سلسلے میں کوششیں بھی جاری ہیں تا کہ دور دراز جیسے مریخ وغیرہ سے آنے جانے والے خلائی جہاز یہاں ٹھہر سکیں اور اپنے لئے ایندھن وغیرہ بھر سکیں۔ اس سلسلے میں روس نے سیلیوت۔۶ اور سیلیوت۔۷ نامی دو خلائی اسٹیشن بنائے، جن میں خلائی جہازوں کے ٹھہرنے کیلئے دو بندرگاہیں (Docking ports) موجود تھیں، جہاں بیک وقت دو جہاز ٹھہر سکتے تھے۔ روس کی طرح امریکہ نے بھی ۱۹۷۳ء سے اپنے خلائی اسٹیشن سکائی لیب (Skylab) وغیرہ خلا میں بھیجے اور جب روس کی معاشی حالت خراب ہوئی تو امریکی سکائی لیب نے روس کے بڑے خلائی اسٹیشن میر (Mir) تک رسد بھی پہنچائی۔ مگر مارچ ۲۰۰۱ء میں روس نے میر کو بحرالکاہل میں غرق کر کے برباد کر دیا۔ اس طرح روس کے خلائی سفر کا وقتی طور اختتام ہو گیا اور امریکہ بھی سمجھ گیا کہ یہ کوئی آسان کام نہیں۔ آخر کار امریکہ اور روس نے مل کر ایک مشترکہ خلائی اسٹیشن جس کا نام انٹرنیشنل اسپیس اسٹیشن (International Space Station) آئی ایس ایس (ISS) رکھا گیا۔

اس پروگرام میں روس اور امریکہ کے علاوہ یورپین اسپیس ایجنسی (European Space Agency) سے تعلق رکھنے والے گیارہ ممالک نیز جاپان اور کینیڈا بھی شامل ہیں، گویا یہ دنیا کی ایک بڑی کمند ہے جس کے ذریعے باقی جسام فلکی تک پہنچنے کی کوشش کی جائے گی۔

یہ مشتِ خاک یہ صرصر یہ وسعتِ افلاک
کرم ہے یا کہ ستم، تیری لذتِ ایجاد

پروفیسر ڈاکٹر فضل کریم اقبال کے مذکورہ بالا شعر کے پس منظر میں یوں لکھتے ہیں:

''یہ شاعر کا تخیل ہے۔ درحقیقت علامہ اقبال ان نوجوانوں سے مخاطب ہیں جو باہمت، اولوالعزم ہیں اور مصائب سے نہیں گھبراتے۔ ستاروں پر کمند ڈالنے والی بات محض تمثیلی ہے۔ تاہم اگر کمند ڈالنی ہی پڑ جائے تو پھر ہم زمین کے نزدیک ترین ستارے پر کمند ڈالنے کی کوشش کریں گے''۔[1]

ڈاکٹر فضل کریم کے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ستاروں پر کمند ڈالنا کوئی آسان بات نہیں۔ اُنہوں نے سب سے نزدیک ترین ستارے پراکسیما سنچوری (Proxima Centauri) کا حوالہ دے کر لکھا ہے۔

''یہ ستارہ زمین سے ۴،۳، نوری سال کے فاصلے پر ہے جس کا مطلب ہے ۴۳ ٹریلین کلومیٹر یا ۲۶ ٹریلین میل، آپ خلائی شٹل میں سوار ہو جایئے جو ۲۷۰۰۰ کلو میٹر یا ۱۷۰۰۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے محوِ پرواز ہو، تو یہ اس ستارے تک پہنچنے میں ایک لاکھ ستر ہزار زمینی سال لے گی''۔[2]

ہوسکتا ہے کہ کوئی ایسا خلائی جہاز بھی بن پائے جس کے ذریعے یہ سفر ممکن ہو سکے۔ یہ

۱۔ کائنات اور اس کا انجام: قرآن اور سائنس کی روشنی میں، ص ۱۳۴۔

۲۔ ایضاً۔

فی الحال قیاس ہے، مگر یہ بات ثابت ہوجاتی ہے کہ زمین سے نزدیک ترین سارے پراکسیما سنچوری کی دوری چوبیس ٹریلین میل ہے جو اسی کہکشاں میں واقع ہے تو باقی کائنات کی وسعت کتنی ہوگی۔ اس ضمن میں اقبال کہتے ہیں۔

اقبال نے انسان کو مشتِ خاک سے تشبیہ دی ہے یعنی انسان مٹھی بھر خاک کے برابر ہے اور اس مٹھی بھر خاک کو زبردست طوفان کا سامنا ہے، جب یہ مٹھی بھر خاک اس آندھی کا سینہ چیر سکے گی، تب جا کر کے اسے کائنات کی وسعتوں کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ اقبال یہ کہنا چاہتے ہیں کہ کائنات کی وسعت کو جاننے کیلئے انسانی قوتیں محدود ہیں۔ دوسرے مصرعے کا طریقہ شاعرانہ شوخی کا طریقہ ہے۔ اس مصرعے نے پہلے مصرعے کی تکرار پر ایک قسم کا ظریفانہ تیر مارا ہے۔ یعنی کائنات کی وسعت کے سامنے انسان کی حقیقت کچھ نہیں ہے کیونکہ کائنات وسیع اور تُو معمولی خاک، لیکن اگر تجھ میں ہمت پیدا ہوجائے اور تیرے اندر عشق کا جذبہ پیدا ہو تو اس کائنات پر کمندیں ڈال سکتا ہے۔

کائنات کی وسعت کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ماہرین فلکیات نے ایک بڑی اور جدید ترین دوربین کے ذریعے کائنات کی وسعتوں کا مشاہدہ کیا ہے۔ اُنہیں آسمان اتنا ہی دور دکھائی دیا جتنا ہمیں آنکھوں سے نظر آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن حکیم میں فرماتا ہے:

وَٱلسَّمَآءَ بَنَيْنَٰهَا بِأَيْيْدٍ وَإِنَّا لَمُوسِعُونَ[1]

ترجمہ: ''اور ہم نے آسمانوں کو (اپنی) قدرت سے بنایا اور ہم وسیع القدرت ہیں''[2]

۱۔ قرآن مجید، سورہ ۵۱، آیت ۴۷۔

۲۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ، مترجم: قرآن مجید عکسے، ص ۶۲۸، ۶۲۹۔

ثناءالحق صدیقی اس آیت کا ترجمہ یوں کرتے ہیں:

''آسمان کو ہم نے اپنے زور سے بنایا ہے اور ہم اس میں توسیع کر رہے ہیں''۔[1]

کائنات کی توسیع کے بارے میں مورس بوکائلے اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

''کائنات کا پھیلاؤ جدید سائنس کی سب سے مرعوب کن دریافت ہے۔ اس وقت یہ ایک نہایت مستحکم تصور ہے اور بحث صرف اس بات پر ہے کہ یہ امر کس طرح انجام پا رہا ہے۔۔۔ ایک کہکشاں دوسری سے دور ہٹتی جا رہی ہے۔ اس طرح کائنات کی جسامت بھی غالباً بڑھتی جا رہی ہے اور کہکشائیں ہم سے جتنی دور ہیں اتنا ہی یہ اضافہ بھی زیادہ ہوتا جائے گا۔ جن رفتاروں سے یہ اجسام سماوی حرکت کر رہے ہیں، اس مسلسل پھیلاؤ کے دوران وہ روشنی کی رفتار کی کسروں سے گزر کر اس سے بھی زیادہ رفتاروں میں منتقل ہو جائیں گی''۔[2]

اللہ تعالیٰ کی تخلیق کی ہوئی کائنات لامتناہی کہکشاؤں سے بھری پڑی ہے۔ بڑی بڑی طاقتور زمینی سطح کی دوربینوں، خلائی دوربینوں (Space Telescope)، ایکسرے دوربینوں (X-ray Telescope)، ریڈیو دوربینوں (Radio Telescope) اور اسپیکٹرواسکوپ (Spactroscope) وغیرہ کے ذریعے ابھی تک صرف ایک سو چار کہکشاؤں کی دریافت ہو سکی ہے، صرف ایک کہکشاں کے مقابلے میں ہمارا کرۂ ارض ایک ایٹم کے پروٹون یا نیوٹرون کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ ہر کہکشاں میں لاکھوں ستارے ہیں اور ہر ستارہ، جسے ہم شام کے بعد رات کے اندھیرے میں ٹمٹماتا ہوا دیکھتے ہیں، ایک مکمل سورج ہے۔ ستارہ ایک ایسا فلکی جسم ہوتا

۱۔ ثناءالحق صدیقی، مترجم: بائیبل، قرآن اور سائنس، (مصنف: موریس بوکائلے)، ص ۲۶۹۔

ترجمہ کے بارے میں مصنف رقمطراز ہیں: ''ہم اس میں توسیع کر رہے ہیں'' ترجمہ ہے ''موسعون، کا جو فعل ''اوسع'' کا حال استمراری کا جمع کا صیغہ ہے۔ اوسع کے معنی وسیع کرنا ہیں، یعنی زیادہ کشادہ، وسعت دیا ہوا، پھیلا ہوا، (ایضاً)

۲۔ ثناءالحق صدیقی، مترجم: بائیبل، قرآن اور سائنس، (مصنف: موریس بوکائلے)، ص ۲۶۸۔

ہے جو سیاروں کی بہ نسبت بہت ہی بڑا ہوتا ہے اور یہ جلتی دہکتی گیسوں پر مشتمل ایک گولہ ہوتا ہے۔ سیارہ ایک فلکی جسم ہوتا ہے جو ستاروں کی بہ نسبت بہت ہی چھوٹا ہوتا ہے، یہ ستارے یا سورج کی قوت کشش کے تحت اس کے چاروں طرف اپنے مدار میں گردش کرتا ہے۔ سیارے کی نہ اپنی گرمی اور نہ ہی اپنی روشنی ہوتی ہے۔

ایک سورج کے چاروں طرف اس کی قوتِ کشش کی حد میں سیارے ہی نہیں ہوتے بلکہ شہابیہ (Asteroids)، چھوٹے چھوٹے سیارے (Planetiods)، شہاب ثاقب (Meteriods) اور دمدار ستارے (Comets) وغیرہ بڑی تعداد میں ہوتے ہیں جس سے ہم دودھیاں کہکشاں (Milkyway Galaxy) کہتے ہیں، اس کے لاکھوں ستاروں میں ایک ستارہ، جسے سورج کہا جاتا ہے، شمسی نظام ہے۔ اب تک ہمیں ایک سو چار کہکشاؤں کی جانکاری حاصل ہوئی ہے۔ مگر ابھی تک ہمیں یہ معلوم نہ ہوسکا کہ ہماری اپنی کہکشاں، جس میں نظامِ شمسی واقع ہے، میں اور کتنے نظام شمسی ہیں یا دوسرے لفظوں میں بن رہے ہیں۔ اقبال اپنے تیسرے خطبے میں کائنات کی اضافیت کا اشارہ دیتے ہیں کہ کائنات میں روز بہ روز اضافہ ہوتا رہتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر وقت نئے نئے ذروں کی پیدائش کرتا ہے۔ یہی ذرے مل کر کائنات میں اضافیت کا سبب بن جاتے ہیں۔ اقبال کے اس اقتباس کا ترجمہ سید نذیر نیازی کے الفاظ میں ذیل میں پیش کیا جاتا ہے:

> ''خالقِ کائنات کی تخلیقی فعالیت کا سلسلہ چونکہ برابر جاری ہے اس لئے جواہر کی تعداد بھی لامتناہی ہے کیونکہ ہر لحظہ نئے نئے جواہر پیدا کئے جارہے ہیں اور اس لئے کائنات میں برابر اضافہ ہورہا ہے۔ قرآن مجید کا بھی یہی ارشاد ہے: ''و اللہ یذید فی الخلق مایشاء''۔[1]

۱۹۲۹ء میں ایک ماہرِ فلکیات ایڈوین ہوبل (Edwin Hubble) نے یہ پتہ لگایا کہ

۱۔ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، ص ۱۳۹۔۱۴۰۔

مجرا ہیں (Gallaxies) ہر طرف سے دور بھاگ رہی ہیں اور یہ کائنات پھیل رہی ہے۔ ہوبل نے اپنے اس نظریہ کو ہوبل کا قانون یا (Hubbles Law) کا نام دیا۔ ہوبل سے پہلے ۱۹۲۲ء میں فریڈمین (Friedmann) نے یہ نظریہ پیش کیا تھا کہ اس کائنات میں پھیلنے اور سکڑنے کے امکانات نظر آتے ہیں۔

آئن اسٹائن کی اضافیت کی رو سے کائنات ایک متحرک نظام ہے، نظریہ بگ بینگ (Big Bang) کائنات کی ابتدائی حالت سے بحث کرتا ہے جس میں تمام مادہ انتہائی چھوٹے حجم میں بے پناہ کثافت، حرارت اور دباؤ کے تحت (عظیم جوہر یا سپر ایٹم کی صورت میں) پھٹ کر موجودہ پھیلتی ہوئی کائنات بنا رہا ہے۔

ان نظریات کے مطابق کائنات برابر پھیل رہی ہے۔ آج کل نئے نظریات سامنے آرہے ہیں جن پر کام برابر جاری ہے، ان نظریات میں ایک نیا نظریہ اسٹرنگ تھیوری کائنات کے پھیلاؤ کا نیا نظریہ ہے، جس پر تحقیق ہو رہی ہے۔ ان نظریوں کے بارے میں ڈاکٹر فضل۔ ن۔م۔ احمد اپنی رائے یوں ظاہر کرتے ہیں:

> ''ہر نظریے میں بگ بینگ کسی نہ کسی شکل میں ضرور موجود ہے کیونکہ وہ چند مشاہدات کا بالکل صحیح صحیح جواب مہیا کرتی ہے۔ بگ بینگ کے بعد کائنات تیزی سے پھیلنا شروع ہوئی مگر پھر ذرا دھیمی ہوئی اور اب روز بہ روز تیز رفتار سے پھیلتی جارہی ہے۔ اس تیز رفتاری کی وجہ تاریک توانائی (Dark Energy) تصور کی جاتی ہے جو مکمل خلاء (Perfect Continuum) میں بدرجۂ اتم موجود ہے''۔[1]

علامہ اقبال کو کائنات کے پھیلاؤ کے بارے میں قرآن حکیم سے گونج سنائی دے رہی ہے کہ یہ کائنات ابھی یعنی ۷۔ ۱۳، ارب سال بعد بھی ارتقائی مراحل میں ہے اور یہی وجہ ہے کہ

۱۔ ماہنامہ سائنس، نئی دہلی، اکتوبر ۲۰۰۵ء، جلد ۱۲، شمارہ ۱، ص ۶

اقبال کو کائنات کی ساخت میں ابھی کمی دکھائی دے رہی ہے کیونکہ یہ کائنات اپنا ضمیر چھپاتی نہیں، اقبال کی چشم بینا پردوں میں چھپے راز دیکھ لیتی ہے، اقبال اپنی چشم سے مشاہدہ کی ہوئی چیزیں اوروں کو بھی دکھانا چاہتے ہیں۔ اُنہیں کائنات میں کمی اس لئے نظر آتی ہے کیونکہ قرآن حکیم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

إِنَّمَآ أَمْرُهُۥٓ إِذَآ أَرَادَ شَيْـًٔا أَن يَقُولَ لَهُۥ كُن فَيَكُونُ [1]

مولانا اشرف علی تھانوی اس آیت کا ترجمہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو بس اس کا معمول تو یہ ہے کہ اس چیز کو کہہ دیتا ہے کہ ہو جا، پس وہ ہو جاتی ہے''۔[2]

اس آیت کے تناظر میں اقبال کے اس شعر کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے ؎

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آرہی دمادم صدائے کن فیکون

مذکورہ بالا آیت کے پس منظر میں علامہ اقبال نے اپنا نظریہ پیش کیا ہے۔ اس آیت میں ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ تمہارا رب وہ ہے جو جس کا ارادہ کرتا ہے تو کہتا ہے کہ ''کن'' یعنی ہو جا، تو وہ (فیکون) ہو جاتی ہے۔ وہ شئے اس کے ارادے کے تحت خلق ہو جاتی ہے۔ اس کے لئے اللہ کو نہ کام کرنا پڑتا ہے نہ محنت کرنی پڑتی ہے۔ نہ وہ کہیں سے لا کر خلق کرتا ہے اور نہ کسی شئے کو تبدیل کر کے بناتا ہے بلکہ اللہ ''نہیں'' ''لا'' سے خلق کرتا ہے یعنی کسی شئے کا کوئی وجود ہی نہیں ہوتا اور اللہ تعالیٰ اس کو لاشئے کو وجود میں لا کر بناتا ہے اس کو ہم اس طرح بھی سمجھ سکتے ہیں۔

۱۔ قرآن مجید، سورہ ۳۶، آیت ۸۲۔

۲۔ قرآن مجید عکسے، ص ۵۳۶۔

بغیر کسی مواد کے کسی شئے کو خلق کرنا عجیب سی بات لگتی ہے مگر جب علم ہو تو کوئی بھی چیز عجیب معلوم نہیں ہوتی بلکہ علم کے بعد ناممکن، ممکن میں تبدیل ہو جاتا ہے یعنی جب علم کا تناسب بڑھتا ہے تو مادہ کا مقدار کم ہو جاتا ہے۔ پہلے ہمارے پاس مائیکرو ٹیکنالوجی (Micro-technology) تھی، جب علوم کا تناسب بڑھا تو ہم نے مائیکرو ٹیکنالوجی میں قدم رکھا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ علوم کے بڑھنے سے مادے کی مقدار میں کمی ہوئی۔ اس نظریہ سے اگر دیکھا جائے جو ''صاحب علم'' ہو اس کیلئے کچھ بھی ممکن ہے جیسا کہ ڈاکٹر فضل۔ن۔م۔احمد لکھتے ہیں:

''۔۔۔ یہ تناسب بتاتا ہے کہ جوں جوں علم بڑھے گا مقدار مادہ کم ہو جائے گی۔ اگر علم بے انتہا (Infinite) ہو جائے تو مقدار مادہ صفر ہو جائے گی یعنی غائب ہو جائے گی۔ لہٰذا بے انتہا علم مترادف ہوا علم غیب کے (Knowledge of Unknown) جو لاشئے کو بھی احاطہ کئے ہوئے ہے۔ ایسی عالم الغیب ہستی، جس کا علم بے انتہا ہو اسے اپنے کسی ارادے کی تکمیل کیلئے کوئی مادہ، توانائی، زمان و مکان یا کسی اور شئے کی پہلے سے قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ آناً فاناً میں ارادے کے مطابق اپنی پوری خصوصیات کے ساتھ وجود میں آجاتی ہے''۔[1]

اب ہم اس بات کو بخوبی سمجھ گئے ہیں کہ جس کے پاس بے انتہا علم ہو، اس کیلئے بگ بینگ کے ایک ایٹم سے اتنی وسیع کائنات بنانا کوئی بڑی بات نہیں اور اب کائنات بنانے کے بعد اس میں اضافہ کرنا بھی کوئی بڑی بات نہیں۔ اس اضافت میں روز بہ روز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کے بارے میں قرآن کے بغیر اور کوئی جواب نہیں دے سکتا۔ یعنی یہ اضافت کون کر رہا ہے۔

۱۔ ماہنامہ سائنس، نئی دہلی، اکتوبر ۲۰۰۵ء، جلد ۱۲، شمارہ ۱۰، ص ۴۔

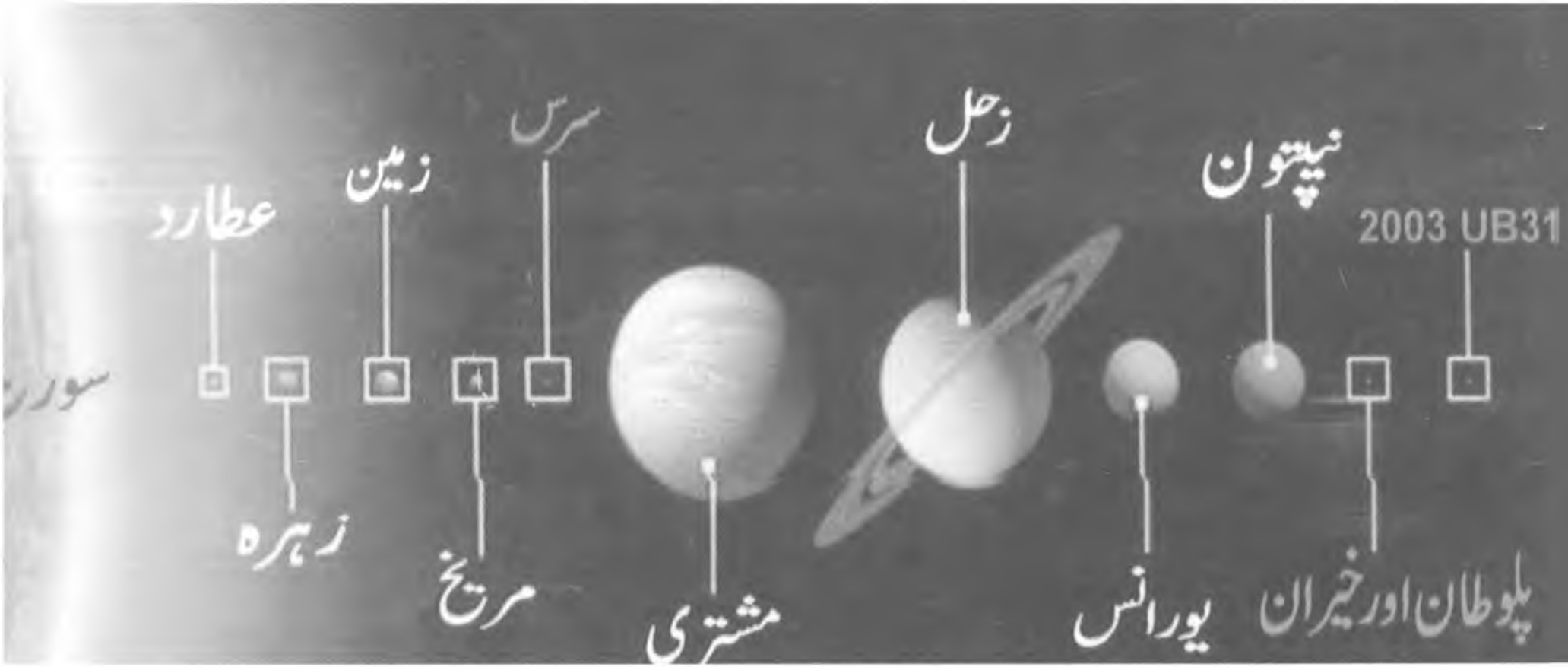

(بحوالہ سہ ماہی سائنس کی دنیا، مدیر ڈاکٹر رویندر کمار، جلد ۳۲، شمارہ ۱۴، اکتوبر۔ دسمبر ۲۰۰۶، ٹیٹل صفحہ)

نوٹ: مندرجہ بالا نقشہ کے ذریعے آپ دیکھ رہے ہیں فلکی اجسام جن کو ہمارے ماہر فلکیات نے حال ہی میں دریافت کیا ہے، یہ اجسام اس بات کی گواہی دے رہے ہیں کہ ابھی نظام شمسی یا اس کے گردوپیش میں نئے فلکی جسم دریافت ہو رہے ہیں، باقی کائنات کی بات ہی نہیں کہ وہاں کیا ہو رہا ہے اور کیا بن رہا ہے، یہی وجہ ہے کہ اقبالؔ کائنات کے ناتمام ہونے کی بات کہہ رہے ہیں۔

نام	عارضی نام	مطلق ظاہری چمک کا درجہ	سطحی چمک	قطر	فلکی اکائی فاصلہ	دریافت کی تاریخ
	2003 UB313*	- 1.1	0.6	~3000 (>2300)	67.7	2005
پلوٹو		-1.0	0.6	2320	39.4	1930
	2005 FY9*	-0.2	0.6	~1900	45.7	2005
	2003 EL61*	0.1	0.6	~1600	43.3	2005
چرون		1	0.4	1270	39.4	1978
(90482) اورکوس	2004 DW	2.3	0.1	~1500	39.4	2004
50,000 کوادر	2002LM60	2.6	0-10 ±0.03	1260 ±190	43.5	2002
28978 IXION	2002 KX76	3.2	0.25-0.50	400 -550	39.6	2001
55636	2002TX300	3.3	>0.19	<709	43.4	2002
55565	2002AW197	3.3	0.14 -0.20	650 -750	47.4	2002
55637	2002UX25	3.6	0.08?	~910	42.5	2002
(20000) ورڈنا	2000 WR 106	3.7	0.12 -0.30	450 -750	43.0	2000
	2002MS4	3.8	0.1	730?	41.8	
	2003 AZ84	3.9	0.1	700?	39.6	
84522	2002 TC 302	3.9	>0.03	<1211	55.1	2002

* سب سے زیادہ چمکیلے کیوپر بیلٹ اجسام جن کی مطلق ظاہری چمک کا درجہ (ABSOWTE MAGNITUDE) 4.0 سے کم ہے۔

حال ہی میں دریافت کئے گئے نئے فلکی اجسام، کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ نظام شمسی کے حصے ہیں۔

(بحوالہ: ماہنامہ سائنس، نئی دہلی، ایڈیٹر محمد اسلم پرویز، جلد ۱۲، شمارہ ۱۰، اکتوبر ۲۰۰۴ء، ص ۲۵۔)

ڈاکٹر فضل کریم کائنات کے پھیلاؤ کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اگر ہم ساری کائنات کا جائزہ لیتے ہیں تو وہ کائنات، جسے ہم نے مرئی کائنات کہا ہے، اس مادے کی تخلیق کی رفتار $100x10^{30}$ ٹن فی سیکنڈ ہے۔ اس سے آپ کو حیران نہ ہونا چاہیے کیونکہ مشاہدے میں آنے والی کائنات بھی بہت بڑی ہے۔ مادے کی تخلیق سے دباؤ (Pressure) پیدا ہوتا ہے جس سے کائنات میں بتدریج پھیلاؤ (Steady Expansism) پیدا ہوتا ہے۔''[1]

علامہ اقبال نے قرآن حکیم کا بغور مطالعہ کیا تھا۔ وہ سائنس کا بھی مطالعہ رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے کائنات کے بارے میں قرآن اور سائنس کے نظریات پر غور و فکر کرنے کی دعوت دی ہے تاکہ انسان توحید کا پابند ہو جائے اور اندھی تقلید، علم نجوم یا جوتش وغیرہ کے جال میں نہ پھنس جائے۔

چنانچہ کہتے ہیں۔

نہ ستارے میں ہے، نے گردشِ افلاک میں ہے
تیری تقدیر میرے نالۂ بیباک میں ہے

کائنات کی ساخت، سیاروں، ستاروں اور دیگر اجسام فلکی کی گردش یہ مظاہر اللہ نے بندے کے اندر عشق پیدا کرنے کیلئے بنائے ہیں تاکہ بندہ خالقِ کائنات کی کاری گری کو دیکھ کر خدا کی وحدت کو جان لے اور اگر وہ خود کو بلند کرنا چاہتا ہے تو اپنے اندر عشقِ رسولؐ پیدا کرے نہ کہ نجومیوں اور جوتشیوں سے اپنی تقدیر بنانے کی کوشش کرے جو ایک فضول اور بیوقوفانہ فعل ہے۔

علم فلکیات یا علم کائنات (Cosmology) سے پہلے ایک علم، جس نے علمِ فلکیات تک پہنچانے کیلئے راہ ہموار کی، اس علم کو علمِ نجوم یا ستاروں کا علم (Astronomy) کہتے ہیں۔ یہ علم

۱۔ کائنات اور اس کا انجام: قرآن اور سائنس کی روشنی میں، ص ۱۸۴۔

کائنات کے بارے میں زیادہ تر مطالعہ انسان کی مستقبل کے بارے میں پیشین گوئی یا دوسرے لوگوں کی قسمت کا حال معلوم کرنے کی ناکام کوشش کے نتیجہ میں وجود میں آیا، اس علم کو نجوم بینی بھی کہا جاتا ہے۔ جواب بھی نئے انداز میں برابر جاری ہے۔

علمِ نجوم دراصل جادوگری کا ایک قدیم طریقہ ہے۔ نجومیوں کا دعویٰ ہے کہ وہ سورج، چاند اور ستاروں کی حرکات وسکنات اور سمتوں کا مشاہدہ کر کے مستقبل کا حال بتا سکتے ہیں۔ اس نجوم کی بنیاد اس حقیقت پر رکھی گئی ہے کہ ان اجسام فلکی کے راستے فلک کی ایک رنگ سی پٹی (Narrow band) میں محدود ہیں۔ اس پٹی کو ''منطقہ بروج'' (Zodiac) کا نام دیا گیا تھا اور اس کو بارہ حصوں میں تقسیم کر کے اور ہر حصے کو ''بروج'' (Sign of the Zodiac) کہا جانے لگا۔ ان برجوں کے نام ہر ایک کے اندر موجود مجمع النجوم کے نام پر رکھے گئے اور ان ہی برجوں کے مطابق نجومی (Astronmar) مستقبل کی پیشین گوئیاں کرتے ہیں۔ علم فلکیات اور اسلام نے اس علم کو یکسر مسترد کر دیا ہے، اس کے باوجود بہت سارے لوگ اس میں دلچسپی لیتے ہیں۔

علامہ اقبال اپنے قاری کو علم نجوم کے بارے میں خبردار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ کہیں یہ علم آپ کو شرک کی طرف نہ لے جائے۔

بتانِ شعوبِ قبائل کو توڑ
رسومِ کہن کے سلاسل کو توڑ
یہی دین محکم، یہی فتح یاب
کہ دنیا میں توحید ہو بے حجاب

ڈاکٹر فضل کریم علمِ نجوم کو خطرناک توہم پرستی سے تعبیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جوتش نہ تو سائنس ہے اور نہ کوئی مذہب، لیکن نہایت ہی خطرناک توہم پرستی ہے

اور اسلام نے ایسے بے بنیاد عقائد سے سختی سے منع فرمایا ہے''۔[1]

علامہ اقبال بھی اس توہم پرستی سے سختی سے منع کرتے ہیں ؎

ستارہ کیا میری تقدیر کی خبر دے گا
وہ خود فراخیٔ افلاک میں ہے خوار و زبوں

جب سے انسان نے ہوش سنبھالا ہے تب سے وہ اس کوشش میں لگا ہوا ہے کہ جس کائنات میں وہ آنکلا ہے اس کی حقیقت معلوم کرے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب تک نہ انسان کو اس کائنات کی حقیقت معلوم ہو جائے تب تک اُسے اپنی حقیقت کے بارے میں واقفیت حاصل نہیں ہوسکتی۔ کائنات کی حقیقت کو جاننے کے بعد اُسے اپنی حقیقت کا اندازہ ہوسکتا ہے، کیونکہ وہ خود بھی کائنات ہی کا ایک اہم جزو ہے اور اپنی حقیقت اسے اس لئے معلوم کرنی ہے تاکہ اُسے معلوم ہو جائے کہ اُسے اپنی زندگی کا استعمال کس طرح کرنا چاہیئے۔ اس کی زندگی کا اصلی مقصد کیا ہے؟ اور وہ اپنی عملی زندگی کی تعمیر اور تشکیل کس طرح سے کرے تاکہ اسے اس دنیا میں اور دوسری دنیا میں اچھے نتائج حاصل ہوسکیں۔

قدرت کا قانونِ تغیرات ہمارے گردوپیش اور خود ہمارے اندر ہر وقت نمایاں ہے۔ تغریات کائنات میں لازمی ہیں۔ جغرافیائی، عمرانی، سیاسی، موسمی تبدیلیاں ایک انسان کے ذہن پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ اس جدید دنیا میں تیکنالوجی کا کافی اثر ورسوخ ہے۔ تیکنالوجی نے زندگی کو یکسر تبدیل کر دیا ہے۔ بدلتے حالات، ماحول کے تناظر میں طرزِ زندگی بھی تبدیل ہوتی جارہی ہے اور آج کا انسان زندگی کو خوشحال بنانے کی جستجو میں ہے۔ آج کا انسان نئے زمانے کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنا چاہتا ہے۔ اگرچہ آج مادہ کے حصول کیلئے اس کی زندگی انتہائی پیشہ ورانہ ہوگئی ہے، مگر ذہنی اعتبار سے اسے سکون میسر نہیں، یہ سکون اسے مادہ نہیں مذہب فراہم

۱۔ کائنات اور اس کا انجام: قرآن اور سائنس کی روشنی میں، ص ۱۴۔

کرسکتا ہے۔

مذہب ملائیت کے ہاتھوں میں ہے، جس نے اسے تنگ نظر اور تعصب کی حد تک مقرر رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کلیسا کے خلاف بغاوت شروع ہوئی اور عیسائیت کے مذہب میں کئی فرقے وجود میں آئے جنہیں احتجاجی اور میتھوڈسٹ وغیرہ وغیرہ کا نام دیا گیا۔ انہوں نے عیسائیت میں کلیسا کی تنگ نظری اور تعصب کے خلاف آواز بلند کی۔

عیسائیت کے برعکس اسلام ایک اعتدال پسند اور تغیر پذیر مذہب ہے۔ اس میں کسی قسم کے احتجاج کی ضرورت نہیں، یہ ایک زندہ و پائندہ مذہب ہے مگر ملاؤں نے اسے فقط روزہ، نماز، حج اور فتوے تک ہی محدود کر رکھا ہے جیسا کہ ڈاکٹر فضل۔ن۔م۔احمد رقمطراز ہیں:

> "۔۔۔جو علم ہمیں چین جا کر حاصل کرنے کی تاکید کی گئی ہے اس کا مقصد اپنے دین پر قائم رہتے ہوئے عصری علوم اور سائنسی علوم وغیرہ بھی حاصل کرتے رہنا ہے، جو روئے زمین پر کہیں پر بھی ملے۔ مگر ہمارے علماء تاکید کرتے رہے کہ دنیا کچھ نہیں بس دین کی فکر کرتے رہو۔ نتیجہ یہ نکلا کہ چار سو سال کے صنعتی انقلاب میں مسلمان نماز ہی پڑھتے رہے اور سائنس و تیکنالوجی کی طرف سے غافل رہے۔ اس لمبے عرصے میں ایک پنسل تک ایجاد نہ کر سکے۔ ہر بات میں مغرب کے محتاج رہے"۔[1]

اقبال اپنے نظم و نثر میں نئی نسل کو یہ پیغام دیتے ہیں کہ اپنے آپ کو حقیقی مسلمان بنانے کیلئے سائنس اور تیکنالوجی کا صحیح استعمال کرو تاکہ آنے والے کل میں مسلمان پسماندہ نہ ہوں۔ وہ قرآن و حدیث کے بنیادی متن کے صحیح معنی نکالنے کی تاکید کرتے ہیں تاکہ نئی نسل دین اور دنیا سے مرعوب نہ ہو۔ اقبال جدید ذہن کے مالک تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلمان جدید تعلیم خصوصاً سائنس اور تیکنالوجی کے میدان میں آگے آئیں۔ ۱۹۳۳ء میں ادارۂ معارف اسلامیہ کے پہلے

۱۔ ماہنامہ سائنس، نئی دہلی، مئی ۲۰۰۶ء، جلد ۱۳، شمارہ ۵، ص ۱۱۔

اجلاس، جو پنجاب یونیورسٹی کے ہیلی ہال میں منعقد ہوا، اقبال نے خطبۂ صدارت دیتے ہوئے مختلف علوم میں مسلمانوں کے شاندار کارناموں کے احیاء کی ضرورت پر ان الفاظ میں زور دیا:

''وقت کا تقاضا ہے کہ اب ہم فقہی جزئیات کی چھان بین کے بجائے ان اہم شعبہ ہائے علم کی طرف متوجہ ہوں جو ہنوز محتاجِ تحقیق ہیں۔ ریاضیات، عمرانیات، طب اور طبعیات میں مسلمانوں کے شاندار کارنامے اب تک دنیا کے مختلف کتب خانوں میں مستور و پنہاں ہیں جن کے احیاء کی سخت ضرورت ہے''۔[۲]

جدید علوم میں اقبال کو اس قدر دلچسپی تھی کہ عمر کے آخری ایام یعنی ۱۹۳۷ء میں فضل کریم کے نام ایک خط میں جدید علوم اور جدید دور کے بارے میں اپنی آراء ظاہر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''ذاتی طور پر میں پسند کروں گا کہ ہمارے نوجوان اسکالرز مسلم ریاضیات، فزیکس، کیمسٹری۔۔۔ کے مطالعہ پر اپنی توجہ مرتکز کریں۔ ان دنوں اسلام کے بہترین مفاد میں ہے کہ علم کی ان ہی شاخوں کا مطالعہ کیا جائے۔ یہی ایک چیز ہے جو مسلمانوں کو جدید علوم کی جڑوں سے روشناس کرائے گی اور انہیں اس قابل بنائے گی کہ جدید دور کے مسائل کو سمجھ سکیں''۔[۱]

جدید دور کے مسائل کا سامنا کرنے کیلئے اقبال پہلے ہی تیار ہونے کی دعوت دے رہے ہیں تا کہ مستقبل میں مسلمان کسی پریشانی میں مبتلا نہ ہوں۔ وہ مسلمانوں کو جدید علوم حاصل کرنے کی تاکید کرتے ہیں اور اپنے اسلاف کے کارناموں پر فخر کرنے کی بجائے اُن کے احیاء پر زور دیتے ہیں۔ وہ اپنی شاعری اور خطبات دونوں میں قرآن و حدیث کے اُن پہلوؤں کو اُجاگر کرتے ہیں جن میں جدید علوم حاصل کرنے کی تاکید کی گئی ہو، اس اعتبار سے سلطانہ مہر اقبال کی

۱۔ پروفیسر وارث میر، عصرِ حاضر کے تقاضے، اقبال اور اجتہاد، اقبال فکر اسلامی کی تشکیل جدید، (مرتب: ڈاکٹر سید حسین محمد جعفری)، ص ۱۴۴۔

۲۔ ایضاً

نسبت لکھتی ہیں:

''علامہ اقبال جدید تعلیم اور روشن خیال لوگوں کے اس نظریئے کے حامی ہیں کہ جب علم حاصل کرنے کیلئے چین جانے کا مشورہ دیا گیا تھا تو علم سے علم دنیا مراد لی جاتی ہے، نہ کہ علمِ دین۔ ظاہر ہے کہ چین میں کوئی دینی درسگاہ یا اسلامی یونیورسٹی موجود نہ تھی، علم دین تو مدینہ منورہ اور مکہ معظّمہ سے زیادہ بہتر طور پر اور کہاں سیکھا جا سکتا تھا۔ البتہ دورِ سائنس کے اعتبار سے اس زمانے میں چین سب سے آگے تھا۔''[1]

سلطانہ مہر کے مذکورہ بالا اقتباس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال نے حضورﷺ کی اس حدیث، جس میں آپؐ نے حصولِ علم کے لئے چین جانے کا مشورہ دیا دراصل علم دنیا حاصل کرنے کیلئے دیا ہے نہ کہ علم دین۔ اور یہ تاثر ختم کرنے کیلئے کہ علم حاصل کرنے کیلئے اگر غیر مسلموں سے بھی استفادہ کرنا پڑے تو کیا کریں۔ اس میں کوئی جھجک نہیں، مذہب اسلام روشن خیالی پر مبنی ہے لیکن ہمارے ملاؤں نے علم کو صرف علم دین بنالیا اور محض اسی بناء پر مسلمان ساری دنیا میں سائنس اور جدید علوم میں سب سے پیچھے رہ گئے۔ اقبال مسلمانوں کے جدید علوم سیکھنے کو وقت کی اہم ضرورت سمجھتے ہیں۔ جناب جسٹس جاوید اقبال لکھتے ہیں:

''اپنے خطبات میں اقبال نے جدید سائنسی نظریات کی روشنی میں علمِ کلام کے مطالعے پر زور دیا ہے تاکہ اسلام کے پیروؤں کے عقائد کو اور مضبوط کیا جا سکے۔ ہوسکتا ہے کہ مذہبی علماء ایسے مسلمانوں کو ''مغرب پرست'' کہیں لیکن اقبال ایسے قدامت پسند بیانات سے قطعی متاثر نہیں تھے۔''[2]

۱۔ اقبال دورِ جدید کی آواز، ص۹۲۔

۲۔ مترجم، فاخر شہیر عباسی، بشکریہ ''ٹائمز آف انڈیا''، نئی دہلی، ۱۷ جون ۲۰۰۴ء، مشمولہ ماہنامہ ''اردو دنیا''، نئی دہلی، ستمبر ۲۰۰۴، جلد ۶، شمارہ ۹، (مدیر: ڈاکٹر حمید اللہ بھٹ)، ص ۶۔

اقبال وہی بات کہتے تھے جو حق پر مبنی ہو، اُن کا مطالعہ کافی وسیع تھا۔ اُنہوں نے ایشیا اور یورپ کے اکثر ممالک کا دورہ کیا تھا، اور اپنی آنکھوں سے یورپ کی ترقی کو دیکھا تھا۔ وہ ہندوستان کو ایک آزاد مستحکم اور ترقی یافتہ ملک دیکھنا چاہتے تھے جس میں مسلمانوں کا کردار اول ہو، مگر اُنہیں یہ فکر لاحق تھی کہ ہندوستان کا مسلمان ملاؤں اور صوفیوں کے چنگل میں پھنس چکا ہے اور اسکا ذہن ترقی سے گھبراتا ہے۔ اقبال نئی نسل کو خوابِ غفلت سے بیدار کرانا چاہتے ہیں اور صوفی و ملا کی زنجیروں سے آزاد کرانا چاہتے ہیں تا کہ مسلمان سائنس اور تیکنالوجی کے میدان میں آگے آئیں اور ترقی کی راہ ہموار ہو جائے۔ چنانچہ بے جھجک ہو کر کہتے ہیں

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق
میں ابلۂ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند

اقبال ابلۂ مسجد اور فرزندِ تہذیب دونوں پر نکتہ چینی کرتے ہیں کیونکہ ایک قدامت کا علمبردار ہے اور دوسرا جدت کا، ابلۂ مسجد پرانی مشرقیت کی علامت ہے اور تہذیب کا فرزند ان افکار و خیالات کی نمائندگی کرتا ہے جو مغرب سے آئے ہیں۔ ابلۂ مسجد ایک جامد مذہبی تصور رکھتا ہے اور صرف عقائد و عبادت سے سروکار رکھتا ہے۔ یہ زندگی کے معاملات کی اہمیت کو نظر انداز کرتا ہے۔ تہذیب کا فرزند مغرب اور مغربی خیالات، وہاں کے نظام زندگی کو نہ صرف قبول کرتا ہے بلکہ اُس کی تقلید میں ہی اپنی نجات سمجھتا ہے۔ ایک روایت کی تقلید میں مصروف ہے، دوسرا جدت کی تقلید میں۔ اقبال دونوں پر طنز کرتے ہیں وہ زندگی میں نئے معنی کی تلاش میں ہیں۔ وہ مشرق اور مغرب کے اس فکر و فلسفہ سے مستفید ہونے کی تلقین کرتے ہیں، جس سے اسلام کو زک نہ پہنچے اور جب وہ اسلام کا اصلی تصور پیش کرتے ہیں تو فرزندِ تہذیب اور ابلۂ مسجد اس پر نکتہ چینی کرتے ہیں

اپنے بھی خفا مجھ سے بیگانے بھی ناخوش
میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

اقبال کو اس بات کی پروا نہیں کہ اس کی نکتہ چینی کی جارہی ہے، وہ حق بات کہتے رہنا اپنا فرض سمجھتے ہیں تا کہ نئی نسل اپنے مستقبل کی صحیح تعمیر کرے۔ جیسا کہ ڈاکٹر فرمان فتحپوری لکھتے ہیں:

''اقبال کے فکر وفن کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی توجہ ''کیا'' ہے؟ سے زیادہ ''کیا ہونا چاہیئے'' پر مرکوز رہی ہے۔ حال سے بیزاری اور جہاں تازہ کی تخلیق کے ذریعے خوش آئند مستقبل کی آرزومندی و بشارت، ان کے فلسفۂ حیات کے ایسے موضوعات ہیں جن کا ذکر ان کی شاعری میں بار بار آتا ہے۔ اس لحاظ سے وہ ''آج'' سے زیادہ ''کل'' کے یا حال سے زیادہ مستقبل کے شاعر ہیں اور ان کا مخاطبہ بزرگوں اور ہم عمروں سے اتنا نہیں جتنا کہ نئی نسل سے ہے''۔[1]

اقبال کا مخاطبہ نئی نسل ہے، وہ اُن کے ذہن میں تبدیلی چاہتے ہیں۔ ایک ایسی تبدیلی جس سے انقلاب آجائے۔ وہ علماء میں بھی تبدیلی کے خواہاں تھے کیونکہ علماء ہی قوم کی رہنمائی کرتے ہیں۔ وہ ایسے علماء چاہتے ہیں جن کے پاس دین کے علم کے ساتھ ساتھ سائنس اور باقی وقتی علوم بھی ہوں۔ اس طرح سے ایسے علماء تیار ہوں جو قدیم و جدید دونوں علوم سے موافقت پیدا کریں تا کہ وہ عصرِ حاضر کے مطابق اسلام کی خدمت کرسکیں۔ یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے؟ اس کیلئے اقبال چاہتے ہیں کہ ''فقہ'' کی تشکیل نو کی جائے۔ اس کے علاوہ اسلامی قوانین یا ''شریعت'' پر عہد جدید کی ضرورتوں کے مطابق نظر ثانی کی جانی چاہیے اور اسلامی مدارس میں نصاب کو عصری تقاضوں کے مطابق ترتیب دیا جائے، یہی اسلام کا اصلی کام ہے۔ اس کے لئے اقبال ''اجتہاد'' کا نظریہ پیش کرتے ہیں۔ اُن کے نظریہ اجتہاد کے بارے میں جسٹس جاوید

۱۔ اقبال سب کیلئے، ص ۱۲۔

اقبال لکھتے ہیں:

''۔۔۔اقبال اجتہاد کے ایک نئے طریقۂ کار کیلئے اپنی تفتیش اور تحقیق کو جاری رکھنا چاہتے تھے جو بدلے ہوئے وقت کی ضرورتوں اور تقاضوں کے مطابق ہو۔۔۔ علاوہ ازیں اقبال چاہتے تھے کہ اسلامی قانون یا ''شریعت'' پر جدید عہد کی ضرورتوں اور تقاضوں کے مطابق نظر ثانی کی جائے۔ ان کے خیال میں صرف مذہبی فرائض یا عبادات ہی کسی قسم کی تبدیلی سے ماوراء ہیں کیونکہ وہ حقوق اللہ ہیں لیکن دنیاوی معاملات حقوق العباد سے تعلق رکھتے ہیں اور ان میں تبدیلی اور ترمیم کی گنجائش ہے۔ دراصل ان حقوق میں اجتہاد کے مسلسل عمل کے ذریعے ترمیم کرنا ضروری ہے تاکہ بدلتے وقت کی ضرورتوں کو پورا کیا جاسکے''۔[1]

اقبال نے اپنی نظم ونثر دونوں میں جو بھی فلسفہ یا نظریہ پیش کیا ہے اس میں حرکت کو اولیت حاصل ہے۔ وہ جمود اور سکوت کے سخت مخالف تھے، قدامت پرستی میں اُنہیں جمود نظر آتا تھا اور جدت پسندی میں خرابی نظر آتی تھی۔ وہ اس جدید نظریہ کے قائل تھے جس میں حرکت کے ساتھ برکت ہو۔ ان معنوں میں اقبال جدیدیت کے علمبردار تھے، جیسا کہ جسٹس جاوید اقبال لکھتے ہیں:

''۔۔۔جدیدیت سے مراد تغیر کی حقیقت کو تسلیم کرنا تھا جو اقبال کے نزدیک ایک طرح سے قرآن کا فرمان ہے کہ آپ تغیر کو سمجھنے کی کوشش کریں اور تغیر کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالیں ورنہ آپ پیچھے رہ جائیں گے''۔[2]

۱۔ مترجم: فاخر شہیر عباسی،، بشکریہ ''ٹائمز آف انڈیا'' نئی دہلی، ۱۷ جون ۲۰۰۴ء، مشمولہ ماہنامہ ''اُردو دنیا'' نئی دہلی، ستمبر ۲۰۰۴ء جلد ۶، شمارہ ۹، (مدیر: ڈاکٹر حمید اللہ بھٹ)، ص ۶۔

۲۔ اقبال فکر اسلامی کی تشکیل جدید، (مرتب: ڈاکٹر حسین محمد جعفری)، ص ۹۲۔

یہاں پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اسلام میں وہ کون سی چیز ہے جو تغیر کا سبب بنے، وہ چیز، جس سے تغیر پیدا ہوتا ہے، اس کی نشاندہی بھی اقبال نے کی ہے، لکھتے ہیں:

"۔۔۔تغیر وہ حقیقت ہے جسے قرآن پاک نے اللہ تعالیٰ کی ایک بہت بڑی آیت ٹھہرایا ہے۔۔۔سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلام کی ہیئت ترکیبی میں وہ کون سا عنصر ہے جو اس کے اندر حرکت اور تغیر قائم کرتا ہے؟ اس کا جواب ہے اجتہاد!"[1]

گویا اجتہاد سے حرکت پیدا ہوتی ہے، جو عنصر حرکت یا تغیر کا باعث بنے، اُسے اختیار کرنا لازمی ہے۔ مگر ہمارے تنگ نظر ملاؤں نے اجتہاد پر پابندی عائد کر رکھی ہے کیونکہ ان کے مطابق اسلام ایک مکمل دین ہے اس لئے اس میں اجتہاد کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے اور آخری دین ہونے کے ساتھ ساتھ یہ ایک روشن خیال مذہب بھی ہے۔ اس لئے اسلام کے اصولوں نے مذہب میں جمود کو رد کرنے کیلئے اجتہاد کے عمل کو لازمی قرار دیا ہے تاکہ اسلام متحرک رہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن حکیم میں فرماتا ہے:

وَمَن جَٰهَدَ فَإِنَّمَا يُجَٰهِدُ لِنَفْسِهِۦٓ[2]

ترجمہ: جو شخص بھی مجاہدہ کرے گا، اپنے ہی بھلے کیلئے کرے گا"۔[3]

ایک اور جگہ اسی سورۃ کی آخری آیت میں ارشاد ربانی ہے:

وَٱلَّذِينَ جَٰهَدُوا۟ فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا[4]

ترجمہ: جو لوگ ہماری خاطر مجاہدہ کریں گے اُنہیں ہم اپنے راستے دکھائیں گے"۔[5]

۱۔ سید نذیر نیازی، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، (علامہ اقبال)، ص ۲۴۹۔

۲۔ قرآن مجید، سورہ ۲۹، آیت ۶۔

۳۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، تلخیص تفہیم القرآن، تلخیص: مولانا صدرالدین اصلاحی، ص ۶۲۴۔

۴۔ قرآن مجید: سورہ ۲۹، آیت ۶۹۔

۵۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، تلخیص تفہیم القرآن، تلخیص، مولانا صدرالدین اصلاحی، ص ۶۳۴۔

مجاہدہ کے لغوی معنی ہیں: ''کوشش، سعی، جدوجہد، جانفشانی''[1]

مذکورہ بالا آیات کے پیش نظر ہم یہ سمجھ سکتے ہیں کہ کسی مخالف طاقت کے خلاف کشمکش اور جدوجہد کرنا مجاہدہ کہلاتا ہے۔

مذکورہ بالا پہلی آیت میں یہ فرمایا گیا ہے کہ جو شخص مجاہدہ کرے گا وہ اپنی بھلائی کیلئے کرے گا اور دوسری آیت میں فرمایا گیا ہے جو لوگ مجاہدہ کریں گے اُنہیں ہم راستہ دکھائیں گے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں اخلاص کے ساتھ جدوجہد اور کشمکش کریں گے اُنہیں بھلائی نصیب ہوگی اور ہم اُنہیں اکیلا نہیں چھوڑیں گے بلکہ ان کی راہوں کو ہموار کریں گے اور ہمارا ساتھ اُن کے ساتھ ہوگا۔

مجاہدہ کے کو پس منظر میں رکھتے ہوئے اب ہم اجتہاد کے معنوں پر نظر ڈالیں۔ مولوی فیروز الدین اجتہاد کے لغوی معنی یوں تحریر کرتے ہیں:

> ''جدوجہد کرنا، کوشش کرنا، ٹھیک راہ ڈھونڈنا، غور وخوض کے بعد کسی مسئلہ کا حل تلاش کرنا اور فقہ اسلامی کی اصطلاح میں قرآن وحدیث اور اجماع پر قیاس کر کے شرعی مسائل اخذ کرنا''۔[2]

مذکورہ بالا معناں پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اجتہاد اور مجاہدہ ایک ہی سکے کے دو رُخ ہیں۔ ان معنوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ قرآن نے اجتہاد کیلئے راہیں کھول رکھی ہیں۔ اب یہ ہمارا کام ہے کہ ہم اُن راہوں سے استفادہ کر سکتے ہیں یا نہیں۔ جو مستفید ہوگا اللہ اس کیلئے راہیں ہموار کرے گا۔ اقبال سورہ ۲۹، آیت ۶۹ کا حوالہ دے کر لکھتے ہیں:

۱۔ جامع فیروز اللغات اُردو، ص ۱۲۰۵۔

۲۔ ایضاً۔

''لغوی اعتبار سے تو اجتہاد کے معنی ہیں کوشش کرنا، لیکن فقہ اسلامی کی اصطلاح میں اس کا مطلب ہے وہ کوشش جو کسی قانونی مسئلے میں آزادانہ رائے قائم کرنے کیلئے کی جائے اور جس کی بناء، جیسا کہ میں سمجھتا ہوں شاید قرآن مجید کی اس آیت ''الذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا'' پر ہے''۔[1]

اجتہاد شریعت کا ایک اصول ہے، یہ اصول بتاتا ہے کہ دین تنگ نظر نہیں ہے بلکہ روشن خیال ہے، ڈاکٹر رشید احمد جالندھری اسلام کی روشن خیالی کے متعلق لکھتے ہیں:

''۔۔۔قرآن مجید کی سورۃ ۲۲ آیت ۷۸ (یعنی اللہ نے دین کے بارے میں تم پر سختی نہیں کی) اور رسول کریمؐ کی حدیث شریف '' لا ضررو لا ضرار ''(یعنی نہ نقصان دو، نہ خود نقصان اُٹھاؤ) کو صحابہ کرامؓ کے اجتہاد کی بنیاد قرار دیا جا سکتا ہے۔ اہل علم نے قانون سازی کے سلسلہ میں مزید کہا ہے کہ وقت بدلنے کے ساتھ ساتھ احکام بدل جاتے ہیں۔ (لاتغیر الاحکام بتغیر الازمان) اس اصول کو تسلیم کرنا بلاشبہ ایک عظیم الشان اجتہادی عمل ہے، جس کی قدر و قیمت کا اندازہ اہلِ بصیرت ہی لگا سکتے ہیں''۔[2]

سنن ابوداؤد میں ایک مشہور حدیث پاک ہے جو اجتہاد کے اصول کا شرعی ماخذ ہے اور جسے حدیث معاذ بھی کہتے ہیں۔ اس سلسلے میں معاذ بن جبلؓ کی روایت ذیل میں درج کی جاتی ہے:

''رسولؐ نے جب اُنہیں یمن کو گورنر منتخب کیا، تو اُن سے کہا اگر تمہارے سامنے کوئی معاملہ پیش آئے تو تم اس کا فیصلہ کس طرح کرو گے۔ معاذؓ نے جواب دیا کہ میں خدا کی کتاب کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ رسولؐ نے فرمایا اگر تم خدا کی کتاب میں

۱۔ سید نذیر نیازی، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ (اقبال)، ص ۲۴۹۔

۲۔ اقبال۔ فکر اسلامی کی تشکیل جدید، ص ۱۲۰۔

نہ پاؤ، معاذؓ نے جواب دیا تو رسولؐ کی سنت کی رُو سے فیصلہ کروں گا۔ رسولؐ نے فرمایا اگر تم رسول اللہ کی سنت میں نہ پاؤ، معاذؓ نے کہا تو میں اپنی رائے کے مطابق اجتہاد کروں گا اور اس میں دقیقہ فروگزاشت نہیں کروں گا۔ وہ کہتے ہیں کہ رسولؐ خوش ہوئے اور معاذ کو دعا دی کہ اے اللہ تو نے معاذ کو جس چیز کی توفیق دی تیرا رسولؐ خوش ہے''۔[1]

قرآن حکیم کی سورۃ ۳ آیت ۱۳۶ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے، جس کا یہاں ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔ ''اے لوگو! جو کلمہ پڑھ کر مومن ہوئے ہو شعوری طور دریافت کی سطح پر مومن بنو''، تاکہ آپ میں اسلام کا صحیح تصور قائم ہو جائے۔ اسلام میں قرآن و حدیث کے بعد شریعت کا تیسرا ماخذ 'فقہ' کو سمجھا جاتا ہے۔ فقہ ایک اجتہادی علم ہے۔ اجتہاد شریعت کا ایک اصول ہے جس کے معنی ہیں قرآن اور حدیث اور اجماع پر قیاس کر کے کسی شرعی مسئلے کا حل نکالنا، مگر خیال رہے کہ اجتہاد شریعت کے اصولوں پر مبنی ہونا چاہیے، کہیں ایسا نہ ہو کہ اجتہاد بدعت کا سبب بن جائے اور یہ دین کیلئے خطرہ ثابت ہو۔ حدیث نبویؐ ہے:

''من أحدث أمرنا هذا ما ليس فهورد''[2]

ترجمہ: یعنی جو شخص ہمارے دین میں کوئی نئی چیز نکالے جو اس میں نہیں ہے تو وہ قابل رد ہے۔''[3]

گویا اجتہاد کے دوران اسلام کے بنیادی اصولوں کا خیال رکھنا بے حد ضروری ہے کیونکہ اجتہاد کا کام اسلام کو اصل انداز میں پیش کرنا ہے نہ کہ اسلام کی اصلیت کو زک پہنچانا،

۱۔ سنن ابوداؤد، کتاب المعاذ بن جبل، ص ۲۳۱۱۔

۲۔ الرسالہ، اپریل ۲۰۰۵ء، ص ۲۶۔

۳۔ ایضاً، ص ۲۷۔

قرآن نے بار بار کائنات کے حقائق کا مشاہدہ کرنے کی تاکید کی ہے اور اہلِ عقل کو سوچ بچار سے کام لینے کا مشورہ دیا ہے تاکہ معاشرے کی صحیح رہنمائی کی جائے۔ اجتہاد کا نظریہ بھی یہی ہے کہ جدوجہد، کوشش اور کشمکش سے دین کی از سرِ نو تعمیر ہوتا کہ دین کا بنیادی تصور لوگوں تک پہنچے، نہ کہ دین لوگوں کیلئے تنگ نظر ثابت ہو۔

اجتہاد کے لغوی معناں کو مدنظر رکھتے ہوئے اجتہاد سے مراد ہے کسی شرعی حکم کے استنباط میں فقیہ کا اس حد تک محنت سے کام لینا کہ اس سلسلہ میں مزید محنت اُس کے بس سے باہر ہو، یہاں پر یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ اجتہاد وہیں ہوتا ہے جہاں پر کسی شرعی حکم میں کوئی قطعی دلیل نہ ہو، مثلاً روزہ، زکوٰۃ، نماز وغیرہ کیلئے کوئی اجتہاد نہیں کیونکہ ان کی قرآن حکیم نے مکمل دلیل فراہم کی ہے۔

اجتہاد کیلئے یہ ضروری نہیں کہ ایک ہی شخص ہو جو ''اجتہاد'' کرے، معاملہ یہ ہے کہ اکثر اوقات ہمارے ملا اجتہاد کے عمل کو روکنے کیلئے یہ کہتے ہیں کہ اس کیلئے ایک ایسے مجتہد کی ضرورت ہے جسے دین کے بارے میں مکمل واقفیت ہو۔ مگر مجتہد کے بارے میں حدیث سے یہ باتیں ثابت نہیں ہوتیں، حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ فرمایا رسول اللہ ﷺ نے:

''ان اللہ یبعث لھٰذا الامة علیٰ راس کل مائة مسنة من یجد دلھا دینھا ''[1]

ترجمہ: اللہ ہر صدی کے سر پر اس امت کیلئے ایسے لوگ اٹھاتا رہے گا جو اس کیلئے اس کے دین کو تازہ کریں گے''۔[2]

مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ مذکورہ بالا حدیث کے بارے میں لوگوں کی غلط فہمی کا ذکر کرتے ہوئے

۱۔ ابو ہریرہؓ، ابوداؤد، تجدید احیائے دین، مصنف: مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، ص ۳۹، ۴۰۔

۲۔ ایضاً

لکھتے ہیں:

''اس حدیث سے بعض لوگوں نے تجدید اور مجددین کا بالکل ہی ایک غلط تصور اخذ کرلیا۔ انہوں نے علیٰ رأس کل مسأۃ سے صدی کا آغاز یا اختتام مراد لے لیا ہے اور من یجدد لھا کا مطلب یہ سمجھا کہ اس سے مراد غالباً کوئی ایک شخص ہے۔۔۔ حالانکہ نہ رأس کے معنی سر کے ہیں اور صدی کے سر پر کسی شخص یا گروہ کے اٹھائے جانے کا مطلب صاف طور پر یہ ہے کہ وہ اپنے دور کے علوم، افکار اور رفتار عمل پر نمایاں اثر ڈالے گا۔۔۔ من سے مراد ایک شخص بھی ہوسکتا ہے، بہت سے اشخاص بھی ہوسکتے ہیں اور پورے ادارے اور گروہ بھی ہوسکتے ہیں۔''[1]

اصل میں حضور ﷺ کے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ہر صدی میں ایسے لوگ آئیں گے جو اسلام کو اس کی اصل صورت میں از سرِ نو قائم کرنے کی کوشش کریں گے۔ اس کوشش کیلئے ایک شخص بھی ہوسکتا ہے اور متعدد اشخاص یا اشخاص پر مبنی کوئی ادارہ یا پھر کوئی گروہ، کیونکہ مذکورہ بالا حدیث میں لفظ ''من'' کے معنی ایک شخص بھی ہوسکتا ہے اور متعدد اشخاص بھی یا ادارہ یا جماعت لفظ ''من'' عربی زبان میں واحد اور جمع دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

جہاں تک میرا خیال ہے اقبال نے شاید اسی حدیث کو پس منظر میں رکھتے ہوئے اجتہاد کیلئے جماعت اور ایک مکمل ادارہ تشکیل دینے کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ ۱۹۳۲ء میں اپنے ایک صدارتی خطبے میں انہوں نے جو تجویز پیش کی تھی اُسے سید احمد اکبر آبادی اپنے مضمون ''اقبال کا نظریۂ اجتہاد'' میں یون درج کرتے ہیں:

''میرا خیال ہے کہ علماء کی ایک اسمبلی تشکیل دی جائے جس میں وہ مسلم قانون دان

۱۔ ابو ہریرہؓ، ابوداؤد، بحوالہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، تجدید احیائے دین، ص ۳۹۔۴۰۔

بھی موجود ہوں جنہوں نے علم جدید حاصل کیا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ اسلام کے بنیادی اصولوں کی روح کے عین مطابق موجودہ حالات کی روشنی میں اسلامی قانون کا تحفظ کیا جائے، اس کو وسعت دی جائے اور اگر ضرورت محسوس ہو تو نئی تاویل کی جائے تاکہ کوئی بھی قانون، جو مسلم پرسنل لا کی تعریف میں آتا ہے اس جماعت کی منظوری سے پہلے قانون سازی کیلئے پیش نہ کیا جا سکے۔''[1]

اقبال کی مذکورہ بالا تجویز بے شک ایک جرأت مندانہ قدم ہے، یہ نئے زمانے کے نئے نظریوں کی مکمل ترجمانی ہے۔ اقبال کو معلوم تھا کہ ہمارے علماء میں سیاسی شعور نہیں ہے اور اس پر طرہ یہ کہ علماء اگر سیاست میں حصہ بھی لیں تو کامیاب ہونے کی کم ہی توقع ہے، کیونکہ ان کے پاس وسائل کی کمی ہوتی ہے۔ اس لئے اقبالؒ یہ تجویز پیش کرتے ہیں کہ وہ علماء جو دینی اور دنیاوی علوم پر دسترس رکھتے ہوں، انہیں الگ طریقے سے نامزد کر کے علماء کی الگ اسمبلی تشکیل دی جائے جیسے ہمارے پارلیمنٹ کے ساتھ 'راجیہ سبھا' یا ہماری اسمبلی کے ساتھ 'کونسل' ہوتی ہے، اس طرح اسلامی ممالک میں پارلیمنٹ کے ساتھ ایوان بالا علماء پر مبنی ہو، اس سے ایک تو اسلامی قانون کا تحفظ کیا جائے گا۔ دوسرے یہ کہ نئے قانون بناتے وقت اسلام کے بنیادی قوانین کا خیال رکھا جائے اور ہر قانون کی منظوری پہلے علماء کے ایوان سے لی جائے، چونکہ علماء کا ایوان ان لوگوں پر مشتمل ہوگا، جو اسلامی تعلیمات کے ساتھ ساتھ ہر عالم اپنے اپنے میدان میں ماہر ہوں، جیسے سیاسیات، سماجیات، معاشیات، لائبریری سائنس، تعلیم، قانون، طب، ریاضیات، حیوانیات، علاج، فلکیات، زراعت، نباتات، فنون لطیفہ، تاریخ، سائنسی علوم، ادبیت، سماجی علوم، جغرافیہ وغیرہ وغیرہ میں مکمل جانکاری رکھتے ہوں اور ہر عالم کو اسی صورت میں نامزد کیا جائے کہ اُسے اسلامی تعلیمات کی مکمل جانکاری کے ساتھ ساتھ اپنے مضمون پر مکمل دسترس

۱۔ فکر اقبال (مقالات، حیدرآباد سمینار)، مرتب ڈاکٹر عالم خوندمیری، مغنی تبسم، ص ۲۱۶۔

حاصل ہو یا دوسرے الفاظ میں تقابلی مطالعہ رکھتا ہو۔ اس طرح ایک نامزد عالم اپنے آپ میں ایک مکمل ادارہ ہوگا۔

جب کوئی قانون ایوانِ بالا میں پیش کیا جائے تو ایسے علماء زیر بحث قانون پر غور وفکر کر کے قرآن، حدیث اور وقت کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنی متفقہ رائے دیں گے۔ اور اگر یہ قانون علماء کی مجلس سے منظور ہوا، تب جا کر کے اس قانون کو ایوانِ نمائندگان میں پیش کیا جائے، یہ ایک ایسا عمل ہے جس کے ذریعے سماج میں ہو رہی برائیوں کو روکا جا سکتا ہے کیونکہ مسلمان جس کسی ملک میں رہتے ہوں وہ اپنے نجی معاملات کو نمٹانے کیلئے زیادہ تر شریعت کا ہی سہارا لیتے ہیں کیونکہ ایک مسلمان کیلئے ذہنی اور قلبی نقطۂ نظر سے شریعت ہی عظیم ہے، اس طرح ریاستی قانون بالائے طاق رہ جاتے ہیں، مگر کچھ شرعی قوانین اس قدر سخت ہوتے ہیں کہ وہاں ریاستی قانون کا ہی سہارا لینا پڑتا ہے اور شرعی قانون بالائے طاق رہ جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ریاستی قانون کو شرعی بنانے کیلئے اجتہاد لازمی ہے۔

اجتہاد اسی صورت میں لاگو کیا جا سکتا ہے جب کوئی مجلس، بورڈ یا اسمبلی وغیرہ جو علماء پر مبنی ہو اور جس کو حکومت کا مکمل تعاون حاصل ہو اور وہ کسی قانون کو اجتہادی نقطۂ نظر سے دیکھنے اور پرکھنے کے بعد اپنی رائے دے کر منظور کریں۔

اقبال کا نظریہ بھی یہی تھا، وہ جدید وقت کے جدید تقاضوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے اجتہاد کو استعمال کرنے کی تاکید کرتے ہیں تاکہ لوگ اسلام کے اصل اصول کا مکمل طور پر فائدہ حاصل کر سکیں کیونکہ اسلام کسی کیلئے سختی نہیں کرتا (سورہ ۲۲، آیت ۷۸)۔ بلکہ اسلام شعوری طور دریافت کی سطح پر مومن بننے کی تاکید کرتا ہے (سورہ ۳ آیت ۱۳۶)

یہی وجہ ہے کہ ہمارے اسلاف خصوصاً صحابہؓ، تابعین، اہل بیت، علماء وغیرہ شعوری طور

مومن تھے، اُنہوں نے قرآن وحدیث کا مکمل مطالعہ کیا تھا اور انہوں نے اس مطالعہ کے پیش نظر اجتہاد کے کارنامے انجام دئے تھے۔ ڈاکٹر مشتاق احمد گنائی رقمطراز ہیں:

''سلطنت اسلامیہ کی وسعت سے جب مختلف معاشی اور معاشرتی مسائل پیدا ہوگئے تو جب امام ابوحنیفہؒ اور دوسرے فقہیوں کو احادیث و روایات سے کوئی رہنمائی نہیں ملتی تھی تو انہوں نے پھر ان مسائل کو حل کرنے کیلئے اپنے رواج وادوار کے بدلتے ہوئے رجحانات کو ملحوظ نظر رکھ کر اسلامی قوانین کی تشریح وتوضیح میں ذاتی رائے کو استعمال کیا۔''[1]

ذاتی رائے کا مطلب قیاس ہے یعنی امام ابوحنیفہؒ نے قیاس سے کام لیتے ہوئے یہ سوچا ہوگا کہ عرب جغرافیائی، تاریخی، سیاسی، اور سماجی اعتبار سے غیر عرب سے مختلف ہیں۔ اس لئے ان کا رہن سہن اور رسم ورواج ایک دوسرے سے مختلف ہونگے، اسی اختلاف کو مدنظر رکھتے ہوئے ان علاقوں میں وہ قوانین ٹھیک نہیں جو عرب معاشرے کیلئے بنائے گئے ہوں۔ اس لئے یہاں کے قوانین یہاں کے ماحول کے مطابق ہونے چاہیں۔ حنفی فقہا کے اس رجحان کے خلاف حجازی فقہا نے احتجاج کیا کیونکہ دونوں فقہا کے مزاج میں اپنی اپنی نوعیت کا اثر تھا یعنی امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کے مسالک میں عربی روح سموئی ہوئی تھی اور امام ابوحنیفہؒ کے قیاس پر مبنی خیالات پر عجمی اثر تھا۔

اقبال امام ابوحنیفہؒ کے اس عجمی اثر کی تعریف کرتے ہیں کہ انہوں نے نفسیات کے مطابق فیصلہ صادر کیا۔ لکھتے ہیں:

''۔۔۔امام ابوحنیفہؒ۔۔۔جس کی بدولت اس ضرورت کا احساس ہوا کہ اصول فقہ کی تعبیر وترجمانی میں زندگی کے حقیقی تنوع اور حرکت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئیے۔

۱۔ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ کے مسلم اعلام، ص ۸۰۔

لہٰذا آگے چل کر مذہب حنفی میں وہ سب نتائج جو۔۔۔نزاعات سے مرتب ہوئے، جذب ہوتے چلے گئے۔لہٰذا یہ مذہب اپنی بنیاد اور اساسات میں کاملاً آزاد ہے اور یہی وجہ ہے کہ بمقابلہ دوسرے مذاہب فقہ اس میں کہیں زیادہ صلاحیت پائی جاتی ہے''۔[1]

اسلام نے اجتہاد کیلئے راہیں ہموار کر رکھی ہیں تا کہ آنے والی نسلیں ان راہوں پر چل کر آگے بڑھیں، ان وسیع راہوں میں تنگ نظری کو یکسر مسترد کیا گیا ہے۔ یہ راہیں نئی نسل کو روشن سمت کی طرف گامزن کرتی ہیں۔قرآن نے کھلے ذہن سے سوچنے کا موقعہ فراہم کیا ہے تا کہ لوگوں میں وسعت نظر پیدا ہو جائے۔ دراصل اجتہاد کا مدعا و مقصد یہ ہے کہ اسلام کے ابدی احکام کا گہرائی کے ساتھ مطالعہ کیا جائے اور پھر ان احکام کو اصل اصول کے ساتھ جدید حالات پر از سر نو منطبق کیا جائے کیونکہ اجتہاد تطبیق نو (re-application) کا نام ہے اور ہمارے دین نے ان احکام کا استعمال کرنے کی پوری آزادی دے رکھی ہے تا کہ اسلام کے ابدی احکام کی تطبیق نو ہو۔

اجتہاد کے تعلق سے حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا، یا رسول اللہؐ! ہمیں بعض اوقات ایسے امور سے واسطہ پڑتا ہے، جن کے بارے میں نہ تو قرآن مجید میں کچھ نازل ہوا ہے اور نہ ہی آپ کی سنت نے کوئی فیصلہ دیا ہے، اس پر رسول کریمؐ نے فرمایا:

''ایسی صورت میں مومنین میں سے اہل علم کو اکھٹا کرو اور زیر بحث مسئلہ کو باہمی مشورہ سے طے کرو اور کسی ایک رائے پر فیصلہ دو''۔

اس واقعہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ رسولؐ اور صحابہؓ کو اس حقیقت کا اعتراف ہے کہ زندگی تغیر پذیر واقع ہوئی ہے اور نیا دن، نیا وقت اپنے جلو میں نئے مسائل اور نئی مشکلات لاتا ہے، ان مسائل و مشکلات کا حل غور و فکر کے بعد ان مسائل پر اجتہاد کرنا ہے۔ شاہ ولی اللہ محدث

۱۔ سید نذیر نیازی، مترجم: تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، ص ۲۸۹۔

دہلویؒ، حضورؐ کے اجتہاد کی حقیقت کے بارے میں رقمطراز ہیں:

''آپؐ کے اجتہاد کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے (علم لدنی کے طور پر) آپ کو شریعت کے مقاصد اور اس کے احکام و غایات سمجھا دئے اور تشریح و تفسیر کے اصول بھی بتا دئے۔ آپ نے انہی مقاصد اور اصول کو پیش نظر رکھ کر اپنے اجتہاد نبوت کو استعمال کیا''۔[1]

شاہ ولی اللہ دہلوی کے مذکورہ بالا اقتباس کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ حضور ﷺ کی احادیث نہ وحی کی بنیاد پر تھیں، اور نہ ہی شرعی قواعد و اصول کی بنیاد پر، بلکہ ان کی بنیاد وسیع دنیاوی تجربہ، شخصی فراست، وقتی مصلحت، ذاتی عادات اور قومی رسم و رواج پر تھی۔ اسی بنیاد پر خلفائے راشدین اور صحابہؓ وغیرہ نے بھی اپنے اپنے زمانے میں اجتہاد سے فائدہ اٹھایا۔

حضرت عمرؓ ایک عظیم المرتبت فقیہ تھے۔ ایک روز اُنہیں حسبِ دستور کوئی فیصلہ سنانا تھا، فیصلہ ایک زانیہ عورت کا ہونا تھا۔

حضرت عمرؓ نے ایک زانیہ عورت، جو حاملہ تھی، کو سنگسار کرنے کا حکم دیا۔ حضرت علیؓ یہ کہہ کر اس پر معترض ہوئے کہ بدکاری کے جرم میں آپ زانیہ عورت کو سنگسار کر سکتے ہیں، مگر اس کے شکم میں جو بچہ ہے اس نے تو کسی جرم کا ارتکاب نہیں کیا ہے۔

چنانچہ حضرت عمرؓ نے اپنے موقف سے رجوع کر لیا اور فرمایا اگر علیؓ نہ ہوتے تو عمرؓ برباد ہو جاتے۔

حضور کے زمانے کے مقابلے میں حضرت ابوبکر صدیقؓ نے شرابی کی سزا بڑھا کر چالیس کوڑے مقرر کئے۔ حضرت عمرؓ نے اپنے زمانے میں اسی سزا کو اور بڑھا کر دوگنا یعنی اسی کوڑے مقرر کئے۔

۱۔ مولانا عبدالرحیم، مترجم: حجۃ اللہ البالغہ (اردو ترجمہ)، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، جلد اول، ص ۶۰۴۔

قرآن کا حکم ہے کہ جس نے چوری کی اُس کے ہاتھ کاٹو، حضرت عمرؓ نے قحط کے زمانے میں اس سزا کو بند کیا، ایک شخص کے غلاموں نے کسی کا اونٹ چرا کر کھالیا۔ تحقیق کے بعد حضرت عمرؓ نے چوروں کو معاف کیا اور اونٹ کے مالک کی رقم غلاموں کے مالک کو دینے کا حکم دیا وجہ یہ بتائی کہ اس جرم کے مرتکب حقیقت میں تم ہو جس نے ان غلاموں کو بھوکا رکھا۔

حضور ﷺ کا فیصلہ یہ تھا کہ کسی مسلمان کا مال اس کی رضامندی کے بغیر لیا نہیں جا سکتا لیکن حضرت عمرؓ کے زمانے میں ایک شخص نے شکایت کی کہ اس کی زمین تک پانی اس صورت میں پہنچ سکتا ہے کہ پانی کی نالی فلاں شخص کی زمین پر سے گزرے اور وہ اس کیلئے رضامند نہیں ہوتا۔ حضرت عمرؓ نے حکم دیا کہ وہ شخص اسے پانی لے جانے دے اور اس میں کسی قسم کی مزاحمت نہ کرے۔

حضورؐ اور صحابہؓ لوگوں سے تحفے قبول فرمایا کرتے تھے لیکن حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے یہ کہہ کر تحفہ قبول کرنے سے انکار کیا کیونکہ آج کل تحفہ رشوت کے طور پر دیا جاتا ہے۔

حضرت عمرؓ نے میراث کے قضیہ میں حقیقی اولاد کو میراث سے محروم رکھنے کا فیصلہ دیا۔ کچھ عرصہ بعد میراث کا یہی قضیہ اُن کے سامنے دوبارہ آیا تو انہوں نے حقیقی اولاد اور ماں میں شریک اولاد دونوں کو میراث میں حصہ دینے کا فیصلہ دیا۔ جب آپ سے آپ کے پہلے فیصلے کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے جواب میں فرمایا: پہلا فیصلہ وہی تھا جو ہم نے اپنے اجتہاد کے مطابق اُس وقت صادر کیا تھا، اور یہ فیصلہ جو ہم اب دے رہے ہیں اِس اجتہاد کے مطابق ہے۔

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ایک فیصلہ کو دوسرے اجتہادی فیصلہ سے تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ اجتہاد ایک ایسا عمل ہے جس سے دین روشن خیال محسوس ہوتا ہے۔ اس لئے ہمارے علماء کو چاہیے کہ جدید مسائل کا ازالہ کرنے کیلئے اجتہاد سے

کام لیں۔

مذکورہ بالا اقتباسات سے ہم یہ سمجھ سکتے ہیں کہ کس طرح صحابہؓ اجتہاد سے مستفید ہوتے رہتے اگر صحابہؓ کیلئے کوئی پابندی نہیں، تو ہم اس پابندی میں کیوں قید ہیں کہ ''اجتہاد کا وقت چلا گیا'' بلکہ اس وقت اجتہاد کی سخت اور زیادہ ضرورت ہے کیوں کہ سائنس اور تیکنالوجی نے نت نئے مسائل کو جنم دیا ہے، اس کے علاوہ بینکنگ، نجی کاری، معاشی مسائل، نجی مسائل، تعلیمی مسائل، ماس میڈیا، اور دیگر عصری مسائل، جنہوں نے ایک مسلمان کے ذہن کو تناؤ میں مبتلا کر رکھا ہے۔ آج کی صدی کا مسلمان دوراہے پر کھڑا ہے جس پر اجتہاد ہی اس کی معاونت کر سکتا ہے۔ اقبال نے موجودہ زمانے کے اہم مسائل کو اسلامی حکمت و تدبر کے حوالے سے حل کرنے کی تجویز پیش کی ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''میرا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کا مذہبی فلسفہ اس انداز میں پیش کیا جائے کہ اسلام کی فلسفیانہ روایات کو بھی ملحوظ خاطر رکھا جائے اور انسانی افکار کے جدید انکشافات اور اختراعات سے بھی ثبوت مہیا کئے جائیں۔ ہمارا فرض ہے کہ فکرِ انسانی کے ارتقاء پر نظر رکھیں اور آزادانہ تنقید اسلوب قائم کریں۔''[1]

اسلام ایک حرکی مذہب ہے۔ اقبال کے نزدیک اسلام ہر مسئلے کا حل ہے، نہ کہ مسئلہ پیدا کرتا ہے اور حضورؐ کی ذاتِ مبارک قدیم اور جدید دونوں زمانوں سے متعلق ہے بلکہ آپؐ کی ذات مبارکہ ان دو زمانوں کے درمیان ایک واسطہ ہے جیسا کہ اقبال لکھتے ہیں:

> ''اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یوں نظر آئے گا جیسے پیغمبر اسلامؐ کی ذات گرامی کی حیثیت دنیائے قدیم اور جدید کے درمیان ایک واسطہ کی ہے۔ بہ اعتبار اپنے سرچشمۂ وحی کے، آپ کا تعلق دنیائے قدیم سے ہے لیکن بہ اعتبار اس کی روح

۱۔ مترجم: سید نذیر نیازی، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، ص ۳۹۔

کے، دنیائے جدید سے۔ یہ آپؐ ہی کا وجود ہے کہ زندگی پر علم وحکمت کے وہ تازہ سرچشمے منکشف ہوئے جو اس کے آئندہ رُخ کے عین مطابق تھے۔"[1]

حضرت امام ابوحنیفہؒ کے شاگرد رشید، حضرت امام ابویوسفؒ سے مروّی ہے کہ انہوں نے فرمایا "من لم یعرف عرف زمانه فهو جاهل "۔یعنی جس نے اپنے زمانے کے عرف اور تقاضے کو نہیں سمجھا وہ جاہل ہے۔

حدیث میں مومن کے بارے میں آیا ہے کہ "آن یکون بصیراً بذمانه" ۔یعنی مومن ایسا ہوتا ہے جو زمانے کے بارے میں باخبر ہو۔

جو شخص زمانے کے عرف اور تقاضے کو نہ سمجھے اور جو شخص زمانے کے بارے میں باخبر نہ ہو اسے کیا نام دیا جاسکتا ہے۔ جاہل یا ناداں، اقبال نے ہمیں اس جہالت سے نکالنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ اب یہ ہمارا کام ہے کہ ہم اسی جہالت میں رہنا چاہتے ہیں یا اس سے باہر نکلنا چاہتے ہیں۔ اقبال لکھتے ہیں:

"۔۔۔اب کہ زمانہ بدل چکا ہے اور دنیائے اسلام ان نئی نئی قوتوں سے متاثر اور دوچار ہو رہی ہے جو فکر انسانی کے ہر سمت میں غیر معمولی نشو ونما کے باعث پھیل رہی ہے۔ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ مذاہب فقہ کی خاتمیت پر برابر اصرار کرتے رہنا چاہیے۔ ائمہ مذاہب کا کیا یہی دعویٰ تھا کہ ان کے استدلال اور بصیرات حرفِ آغاز ہیں؟ ہرگز نہیں۔ اندریں صورت مسلمانوں کا آزاد خیال طبقہ اگر اس امر کا دعویدار ہے کہ اسے اپنے تجربات علیٰ ہذا زندگی کے بدلتے ہوئے احوال وظروف کے پیش نظر فقہ و قانون کے بنیادی اصولوں کی از سرِ نو تعبیر کا حق پہنچتا ہے، تو

۱۔ مترجم: سید نذیر نیازی، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، ص ۲۱۱۔

میرے نزدیک اس میں کوئی ایسی بات نہیں جو غلط ہو۔ قرآن پاک کا یہ ارشاد کہ زندگی ایک مسلسل تخلیقی عمل ہے بجائے خود اس امر کا مقتضی ہے کہ مسلمانوں کی ہر نسل اسلام کی رہنمائی سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اپنے مسائل آپ حل کرے۔ یہ نہیں کہ اسے اپنے لئے ایک روک تصور کریں''۔[1]

اقبال کے یہ الفاظ ذہنی بیداری کا ایک ثبوت ہے اور حرکی تصور کا اعتراف، اقبال کے فلسفے میں حرکت کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ اُن کا فلسفہ دراصل ایسے معانی سے عبارت ہے جو ہر زمانے میں اپنی توانائی کے باعث ہمیشہ زندہ رہے گا اور جدیدیت سے مراد مسلسل چلنے کا نام ہے، نہ کہ کسی ایک زمانے میں گم ہونے کا، اس طرح اقبال اور جدیدیت ان معنوں میں ایک دوسرے کے مترادف ہیں۔

۱۔ سید نذیر نیازی، مترجم: تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، (علامہ اقبال)، ص ۲۷۷۔